دُنیا کی رنگین مزاج عورتیں

یعنی

دُنیا کی بڑی بڑی عشقیہ داستانوں کا مجموعہ

از

راجہ مہدی علی خاں

یہ ایڈیشن

عبدالرحمٰن عنایت اللہ تاجران کتب ہال بازار امرتسر

نے حسب اجازت

نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری گیٹ لاہور

نے

بار سوم — راما آرٹ پریس امرتسر میں باہتمام رامناتھ پرنٹر کے چھپوایا — قیمت دو روپے

پبلشر شیخ عبدالرحمٰن عنایت اللہ تاجر کتب ہال بازار امرتسر

پیش لفظ!

از ادیب الملک حضرت اختر شیرانی

محبت ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی
مفلس بھکاری سے لے کر بادشاہ تک کی گردن اس کے پُر شوکت اور پُر جلال
مندر میں پہنچ کر فرطِ احترام سے خم ہو جاتی ہے۔
وہ کونسا دل ہے جس میں محبت کی دھڑکن موجود نہ ہو۔ اور وہ کونسا سانس ہے۔ جو خوشبوئے محبت سے مملو نہ ہو۔
بعض اوقات محبت اس انداز سے کی جاتی ہے۔ کہ محب اور محبوب دونوں زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات محبت خود ایسے بڑے بڑے انسانوں کے دلوں میں اپنا مسکن تلاش کر لیتی ہے کہ وہ خود زندۂ جاوید معلوم ہونے لگتی ہے پیش نظر عشقیہ داستانوں کے کرداروں کے دلوں میں محبت نے اپنا گھر ڈھونڈا اور اپنی دنیا کے آسمان پر ایک دلکش ستارے کی طرح لازوال چمک پیدا کرنے لگی۔ "رنگین مزاج عورتیں" دنیا کی ان بڑی بڑی عورتوں کے افسانہ ہائے محبت کا مجموعہ ہے جن کا ذکر دنیا کی تاریخ میں موجود ہے۔ ان رنگین داستانوں کو پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ کہ محبت ازل سے ہے اور ابد تک رہیگی ——— بھکاری اور بھکارن کے دل میں بھی، اور بادشاہ اور ملکہ کے دل میں بھی۔ غرضیکہ محبت ہی ہم دنیا والوں کی روحانی غذا ہے۔
اس مجموعے میں ان مشہور عشقیہ داستانوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے جو

بہت زیادہ "رسوا" ہو چکی ہیں۔ میں نے شروع سے لے کر آخیر تک ان تمام داستانوں کو نہایت دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ کہ اس کتاب کے چھپنے سے اردو ادب میں ایک نہایت حسین اضافہ ہو گا۔

داستانیں تو ازل سے ہیں۔ اور ابد تک رہیں گی۔ ان کے قلمبند کرنے کے لئے خوبصورت الفاظ، رنگینیٔ بیان، برجستگی، اور ندرت خیال کی خوبیاں بہت کم لکھنے والوں میں ہوتی ہیں۔ اگرچہ ان داستانوں کو زیادہ شاعرانہ رنگ دینے کے لئے "داستان گو" نے بعض جگہ تاریخی حقائق سے کسی قدر گریز کر لیا ہے لیکن میں یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ راجہ مہدی علی خاں کا قلم اس کتاب میں بعض اوقات صفحۂ قرطاس پر پھول اور ستارے بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے ــــــ ان پھولوں کی خوشبو ہمارے مشامِ جان کو، اور ان ستاروں کی ضیا ہمارے دلوں کے تاریک ترین گوشوں کو منور کرتی چلی جاتی ہے۔

ان داستانوں میں لکھے ہوئے بعض فقرات اتنے خوبصورت ہیں کہ ان پر نثر کی بجائے نظم کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اور انسان کی بے چین روح ایک اضطراب انگیز سی شیریں تسکین محسوس کرنے لگتی ہے۔ افسوس کہ اختصار کے پیشِ نظر میں ان پاروں کا حوالہ نہیں دے سکا۔

امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کا پر جوش خیر مقدم کیا جائے گا۔

اختر شیرانی

ہسپانوی شہزادی کی داستانِ محبت

۱

شہزادی الفنڈا جوزیفا بنا اپنے فلک بوس مرمریں محل کے سامنے شاہی باغ میں بید کے درخت کی ایک جھکی ہوئی شاخ کو ایک سحر آفریں ادا سے تھامے ہوئے بہار کی دیوی کی طرح کھڑی تھی۔ اور اپنی حسین اور شوخ سہیلیوں کے جھرمٹ میں وہ اس طرح معلوم ہو رہی تھی۔ جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند۔

اس کی اخضری آنکھیں سمندر کے پانی کی طرح نیلگوں تھیں۔ اور اس قدر چمکیلی کہ ان پر آسمان جنت کے دو روشن ترین ستاروں کا گمان ہوتا تھا۔ اس کے ابرو ہلال عید کی طرح نازک اور ایک طرف سے خنجر آبدار کی طرح نکیلے تھے۔ اس کے لمبے لمبے ریشمیں بال جن پر چاند کی شعاعوں کا گمان ہوتا تھا۔ اس قدر باریک تھے۔ کہ ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے بھی لہرانے لگتے۔ اور اس کے شانوں کی بلائیں لیتے ہوئے اس طرح نیچے لٹک کر اس کی مرمریں پنڈلیوں کو چومنے لگتے۔ جیسے قصر جنت کے کسی طلائی جھرنے کا سنہرا پانی ننھی ننھی خوبصورت دھاروں کی صورت میں نیچے گر رہا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر انار کی دو کلیوں کا گمان ہوتا تھا۔ باغ کی تتلیاں پھول سمجھ کر ان پر آ بیٹھتیں۔ اور شہزادی ایک انداز مغرور سے مسکرا کر انہیں پرے جھٹک دیتی۔

اس وقت جب کہ اس کے لانبے لانبے بال اس کے شانوں پر پریشان ہو رہے تھے اور وہ باریک چست ریشمی لباس پہنے اپنی نظریں ایک کاغذ پر جمائے کھڑی تھی۔ اس وقت وہ ایک پری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سانس جو پھولوں کی خوشبو سے کہیں زیادہ عنبریں اور نازک تھی، تیز تیز چل رہی تھی۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اس کے حشر آفریں مخملیں

سینے پر ایک حسین تموج کی کیفیت نمایاں تھی۔ اس کی سہیلیاں اس وقت دم بخود کھڑی تھیں۔ اور سب کی نگاہیں اس کے حسین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کاغذ کو تہ کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ایک خوبصورت انگڑائی لے کر اپنی گھبرائی ہوئی نگاہیں سہیلیوں کے چہرہ پر ڈالیں۔ اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔

شہزادی ایک خط اور اس کی دوسری طرف لکھی ہوئی ایک نظم پڑھ رہی تھی۔ یہ خط کس کا تھا؟ اور نظم کس نے کہی تھی؟ شہزادی کے سوا یہ راز کسی کو معلوم نہ تھا شہزادی کی سب سے زیادہ رازدار سہیلی بھی مکتوب نگار کے نام سے واقف نہ تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد سہیلیوں نے دیکھا۔ کہ شہزادی کی آنکھوں سے دو چمکیلے آنسو گر کر خاک میں مل گئے ہیں ——— آسمانِ حسن سے دو ستارے ٹوٹ کر نیچے آ گرے ہیں ——— دو بیش بہا موتی خاک میں مل گئے ہیں۔

شہزادی کی سب سہیلیوں نے اسے مغموم دیکھ کر فرطِ ادب سے اپنے سر جھکا لئے لیکن کسی کو یہ جرأت نہ ہوتی۔ کہ شہزادی سے یہ پوچھے کہ اس غم کا راز کیا ہے؟ آہ وہ شہزادی کے آنسوؤں کو بیش بہا موتیوں سے بھی قیمتی سمجھتی تھیں۔ اگر ان کے بس میں ہوتا۔ تو یہ ان دو موتیوں کو خاک سے اٹھا کر اپنی آنکھوں میں بلکہ اپنے دل کے کسی پوشیدہ گوشے میں رکھ لیتیں۔ بے چاری سب کی سب خاموش رہیں۔ اور کسی نے بھی شہزادی کے دل کا راز معلوم کرنے کی جرأت نہ کی۔

شہزادی کو کوئی غم اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ رو رو کر اس نے بُرا حال کر لیا تھا۔ اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے شاہی باغ میں بے قرار پھرا کرتی۔ بار بار کاغذوں کے ایک پلندے کو جو اس نے ایک سنگِ مرمر کی صندوقچی میں پھولوں کے درمیان رکھا تھا۔ آنکھوں سے لگاتی۔ اور رہ رہ کر اسے چومتی۔ اس کی سہیلیوں نے بارہا اسے بید کے

درخت کے نیچے بیٹھے گھنٹوں خطوں کے مطالعہ میں محو دیکھا تھا۔ وہ ایک ایک خط کو کئی کئی مرتبہ پڑھتی، سینے سے لگاتی اور پھر بے قرار ہو کر اسے چومنے لگتی۔
آہ! ایک ظالم ساحر نے ——— ایک بھکاری نے ——— ایک معمولی سے شاعر نے ——— جو اس وقت اس سے سینکڑوں میل دور تھا۔ اسے ماہی بے آب کی طرح تڑپا دیا تھا۔ اور کسے خبر تھی۔ کہ شہزادی ایک غریب شاعر کے ہجر میں تڑپ رہی ہے ——— ایک ایسے شاعر کے ہجر میں جسے اس نے دیکھا تک نہ تھا۔
ہسپانیہ کے مشہور شاعر لنکاڈیو نے اپنے خطوں اور اپنی نظموں سے شہزادی کی رگ رگ میں اپنی محبت بسا دی تھی۔ تین سال سے وہ شہزادی سے خط و کتابت کر رہا تھا۔ پہلے صرف وہ اس کا اَن دیکھا عاشق تھا۔ بعد میں رفتہ رفتہ شہزادی بھی اس کے خواب دیکھنے لگی۔ اور آخر اس غریب شاعر کو اپنا دِل دے بیٹھی۔ عورت مرد کے چہرے یا اس کے حسن سے محبت نہیں کرتی عورت مرد کی محبت سے محبت کرتی ہے۔ اگرچہ شہزادی نے اپنے محبوب کو نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کی درد انگیز اور عطر میں بسی ہوئی حسین نظمیں تو پڑھی تھیں۔ اس کے عشقیہ خطوط تو گھنٹوں اس کے زیر مطالعہ رہے تھے۔
خط و کتابت کے دوران ہی میں دونوں ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ شاعر نے اپنی دردناک اور صہبائے محبت میں ڈوبی ہوئی نظموں اور جگر پاش عشقیہ خطوط سے شہزادی کو کچھ اس طرح اپنے دام محبت میں گرفتار کر لیا۔ جس طرح ایک سنہری چڑیا صیاد کے جنگل میں آ کر بے بس سی ہو جاتی ہے۔ شاعر کی محبت بھی سچی اور پاک تھی۔ اسے صرف ایک کام تھا ——— شہزادی کو طویل سے طویل خط لکھنا اور اس کی تعریف میں نظمیں کہنا ——— ان نظموں میں وہ بیان کرتا کہ اسے شہزادی سے کس قدر محبت ہے۔ اس کا رُواں رُواں شہزادی کی محبت میں سرشار ہے۔ اور اس

کے خون کا ہر قطرہ ان راہوں میں بہنے کے لئے تیار ہے۔ جن پر شہزادی کو گزرنا ہو۔ اس کے دل میں شہزادی کی محبت اس قدر گھر کر گئی تھی۔ کہ وہ روشنائی کی بجائے اسے اپنے خون سے خط لکھ کر بھیجتا ــــــ اور پھر اتنے طویل خط جتنے شاید کسی نے کسی کو نہ لکھے ہوں ــــــ شہزادی کے حسن کی تعریف میں وہ جو نظمیں لکھتا۔ ان میں وہ یہ ثابت کرتا کہ دنیا میں شہزادی جو زیفا ئینا سے حسین اور کوئی عورت نہیں۔ اور اس حسن کی دیوی کا سب سے زیادہ مخلص پجاری لِلکا ڈیو کے سوا اور کوئی نہیں۔

شاعر کی نظمیں کتنی حسین اور اس کے خط کس قدر دلکش ہوتے تھے۔ شہزادی انہیں بار بار پڑھتی اور جتنا زیادہ پڑھتی۔ اتنا ہی زیادہ اس کے دل میں شاعر کی محبت بڑھ جاتی۔ وہ کئی مرتبہ شاعر کو آمد کی دعوت دے چکی تھی۔ لیکن شاعر کی طبیعت کچھ عجیب ہی قسم کی واقع ہوئی تھی۔ وہ جواب میں لکھتا۔ نہیں، نہیں، میں تم سے نہیں مل سکتا۔ تمہارا وطن اے دیوی مقدس ہے۔ تمہارا محل مقدس، تمہارے باغ مقدس۔ تمہاری راہ گزر مقدس ــــــ ــــــ تمہارے وطن کا ہر ذرہ مقدس۔ پھر میں اپنے ناپاک قدموں سے تمہارے مقدس وطن کو کیوں آلودہ کروں۔ تم آسمانِ حسن کا ایک درخشندہ ستارہ ہو۔ مجھے دور ہی سے اپنی پرستش کرنے دو۔ تم ایک شمع ہو، پروانے کو دور ہی سے اپنا دیدار کرنے دو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں غریب تمہارے معیارِ حسن پر پورا نہ اتروں۔ تمہیں میرے متعلق جو خوش فہمیاں ہو رہی ہیں۔ وہ دور نہ ہو جائیں۔ اگر آپ مجھ سے مل لیں۔ اور مجھے دیکھ لیا۔ تو ایک دوسرے کو دیکھے بغیر ہم نے محبت کا جو طلسمی اور خیالی محل بڑی مدتوں میں تیار کیا ہے وہ نیچے گر کر پاش پاش ہو جائے گا۔ میں عملی صحبت کا قائل نہیں ہوں میری محبت تمام دنیا والوں سے نرالی ہے ــــــ مجھے تمہارے پھول سے لب چومنے کی خواہش نہیں۔ تمہارے مرمریں گلے میں باہیں ڈالنے کی آرزو نہیں۔ تم ایک مقدس پھول ہو۔ اور میرے ہونٹ کبھی اس پھول کو نہیں چھوئیں گے۔

شہزادی کئی مرتبہ اسے بلا چکی تھی۔ اور اس کی فلسفیانہ باتوں کا جواب بھی لکھ چکی تھی، لیکن شاعر اپنی خیالی محبوبہ سے ملنے سے ہچکچاتا رہا۔ اس ظالم نے اس تین سال کے عرصے میں اپنے خون سے شہزادی کو اتنے طویل خطوط اور اتنی نظمیں بھیج دی تھیں۔ جو ایک عورت کو خواہ وہ کس قدر عظیم المرتبت ہی کیوں نہ ہو۔ اپنا بنانے کے لئے کافی نہ ہو سکتی ہیں۔ آہ شہزادی ایک ایسے شخص کو دل دے بیٹھی تھی۔ جس سے اسے حشر تک ملنے کی امید نہ تھی۔ وہ اس سے سینکڑوں میل دور تھا۔ ان دنوں سینکڑوں میل کی دوری کوئی اتنی معمولی نہ سمجھی جاتی تھی۔

پر عظمت شہزادی اب اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے شاعر کی نذر کر چکی تھی۔ وہ شاعر کی تھی۔ لیکن شاعر اس سے سینکڑوں میل دور تھا۔ وہ اکثر اپنے حسین خوابوں میں اپنے شاعر سے ملاقات کرتی۔ خوابوں ہی خوابوں میں اس سے اظہار محبت کرتی۔ خوابوں ہی خوابوں میں ایک حسین نوجوان کی آغوش میں بے تاب ہو کر گر جاتی۔ اور خوابوں ہی خوابوں میں وہ اپنے پھول سے لب شاعر کے لبوں سے ملا دیتی۔ وہ شاعر کو حسن اور خوبصورتی کا ایک زندہ مجسمہ سمجھتی تھی۔

اب اس کی محبت بھی فلسفیانہ سی ہو چکی تھی۔ چنانچہ جب وہ اپنے محل میں اطلس و کمخواب کے بستر پر لیٹ جاتی تو وہ تصور ہی تصور میں اپنے محبوب کو اپنے پاس پاتی تصور ہی تصور میں اس نے اپنی شادی شاعر سے کر لی تھی۔ اور تصور ہی میں وہ اسے اپنے بستر کے سامنے دوزانو پاتی۔ اور پھر آنکھیں بند کر کے سوچنے لگتی۔ کہ شاعر اب میرے بستر پر آ چکا ہے۔ اب وہ میرے خوبصورت بالوں پر محبت سے اپنا ہاتھ پھیر رہا ہے۔ اب اس کا سر میرے سر پر جھک گیا ہے۔ اور اب اس کے ہونٹ میرے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے ہیں۔ ایسے تصورات اس کی رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑا دیتے۔ لیکن جب اس کی فلسفیانہ خیال آرائیوں پر حقیقت غلبہ پا لیتی۔ تو وہ بے چین ہو جاتی۔

یہی حال لفکا ڈیو کا تھا۔ محبت کے متعلق اس کے نظریات بڑے عجیب وغریب تھے۔ وہ ایک فلسفی شاعر تھا۔ وہ شہزادی سے فلسفیانہ محبت کرتا تھا۔ لیکن شہزادی کے آرزو پرور دل میں فلسفیانہ محبت کرنے کی تاب نہ تھی۔ جب شاعر اسے لکھتا کہ میں ایک ادنےٰ بھکاری ہوں، اے شہزادی! میں تیرے پُر عظمت دربار میں کیسے قدم رکھوں۔ تو شہزادی اسے جواب میں بہت طویل اور محبت سے لبریز خطوط لکھتی۔

——— اگر تم بھکاری تھے۔ تو تم نے اپنی نگاہِ انتخاب ایک شہزادی پر کیوں ڈالی؟ اگر تم چاند تک پہنچ نہ سکتے تھے۔ تو تم نے چاند کے دل میں اپنے لئے کیوں کشش پیدا کی؟ تم مجرم ہو۔ پیارے مجرم! میری محبت کی عدالت میں آجاؤ۔ کاش میں شہزادی نہ ہوتی اور تم مجھ سے بے دھڑک مل سکتے۔ پیارے لفکا ڈیو! جب تم مجھ سے ملو گے۔ تو تمہیں خود ہی معلوم ہو جائیگا کہ میرا مزاج کس قدر غریبانہ ہے تم آجاؤ! میں تمہیں کو سارے جہان کا بادشاہ تصور کرونگی۔ میری راتیں تاریک اور دن اداس ہیں۔ میں ندی کے کنارے جنگل میں بیٹھ کر گھنٹوں تمہیں یاد کرتی ہوں۔ میں باغ کے گوشے گوشے میں تمہیں ڈھونڈتی ہوں۔ تمہارے خطوں کو چومتی ہوں۔ بار بار پڑھتی پھر بھی تسکین نہیں ہوتی۔ تم کس قدر سنگدل ہو! اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ تو پھر میری باتیں کیوں نہیں مانتے۔ تم سے ملنے کے لئے میں ہر وقت بے قرار ہوں۔ جس طرح انسان سے سایہ جدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح تم مجھے ایک لمحے کے لئے بھی نہیں بھولتے۔ تم میری محبت کے متعلق بہت دعوے کرتے ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب دعوے جھوٹے ہیں۔ اگر تم میرے سچے پرستار ہو۔ تو میرے آنسوؤں کی قدر کیوں نہیں کرتے۔ تم میرے آنسوؤں کو ستاروں اور موتیوں سے تشبیہہ دیا کرتے ہو۔ اگر یہ واقعی ستارے اور موتی ہیں۔ تو یقین مانو ہر روز بیشمار ستارے اور موتی میں تمہاری یاد میں خاک میں ملا دیتی ہوں۔ اگر تمہارے نزدیک میرے آنسو ایک نایاب اور قیمتی شے ہیں۔ تو انہیں اس طرح کیوں ضائع کر رہے ہو۔ صرف ایک بار آکر مجھ سے مل جاؤ۔

اس کے بعد میں پھر کبھی تمہیں نہ بلاؤں گی۔

شاعر کے دل پر شہزادی کے ایسے خطوں کا بہت اثر ہوتا۔ اور وہ جواب میں ایسی ایسی دردانگیز نظمیں اور خون سے لکھے ہوئے اتنے اتنے طویل خط بھیج دیتا کہ شہزادی کی تمام بے قراری ان کے مقابلے میں ہیچ معلوم ہوتی۔

آخر شہزادی نے ایک دن لفکاڈیو کو لکھ دیا۔ کہ اگر تم ایک ماہ کے اندر اندر مجھ سے نہ ملے تو میں اپنے سینے سے دل نکال کر تمہاری طرف بھیج دوں گی۔ یہ آخری حربہ کام آیا۔ اور شاعر نے اپنی شہزادی سے ڈیڑھ ماہ کی مہلت مانگ لی۔ شہزادی نے خوشی سے اجازت دے دی۔ گو اس کے لئے یہ طویل عرصہ بہت صبر آزما تھا۔ لیکن شاعر کو معلوم ہونے لگا۔ کہ اس کا انجام قریب آپہنچا ہے۔ اور اس نے برسوں کے محبت آمیز خیالوں کا جو قصر رفیع الشان کھڑا کیا تھا وہ گر جانے والا ہے۔ شہزادی سے ملاقات کرنے کے خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ وہ سوچتا کہ حسین و جمیل شہزادی جب مجھے دیکھے گی۔ تو چونک جائے گی۔ کہ جو شاعر اتنی اچھی نظمیں لکھتا تھا۔ اور جس کے خط اس قدر پاکیزہ اور انوکھے ہوتے تھے۔ کیا وہ اتنی معمولی شکل کا انسان ہے۔

شاعر اپنے رازدار افسانہ نگار دوست پانزا سے گھنٹوں شہزادی کی باتیں کرتا رہتا۔ شاعر کے ٹوٹے پھوٹے مکان میں اکثر اس کا افسانہ نگار دوست اپنے افسانوں کے متعلق اس کی رائے لینے آتا اور وہ رات گئے تک ایک حقیر سی شمع کی دھندلی دھندلی روشنی میں باتیں کرتے رہتے۔ اور جب سرد ہوا کا کوئی جھونکا یکایک اس کی کھڑکی کے پٹ کھول دیتا۔ تو لفکاڈیو اپنے دوست سے کہتا۔ "دیکھو شہزادی کے وطن کی طرف سے ہوا آتی ہے۔ کہیں یہ شہزادی کی بے قرار روح تو نہیں" سامنے کے باغ سے خوشبو میں بسی ہوئی خوشگوار ہوا کے لطیف جھونکے اس کے کمرہ کی کھڑکی سے اندر داخل ہوتے۔ تو اپنے دوست سے کہتا کہ "میری شہزادی کے رخسار کے پھول اس کے وطن میں مہک رہے ہیں۔ اور ان

کی خوشبو یہاں تک آپہنچی ہے۔

پانزا شاعر کا دلی دوست تھا۔ اس نے اسے شہزادی کے تمام خطوط بھی دکھا دیئے تھے۔ وہ اکثر اس سے کہا کرتا کہ "آخر تم شہزادی سے مل کیوں نہیں آتے"۔ جواب میں شاعر کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار نظر آنے لگتے تھے۔

لفکاڈیو نے شہزادی کا آخری خط بھی پانزا کو دکھا دیا تھا۔ اور اب دونوں سوچ رہے تھے۔ کہ ان کی آئندہ راہِ عمل کیا ہونی چاہیئے۔

شاعر کہنے لگا کہ "میری محبت دم توڑنے والی ہے۔ میرا انجام قریب آگیا ہے۔ میں نے اپنی نظموں اور اپنے خطوں کے عوض میں شہزادی کی محبت حاصل کی تھی۔ میری ذات کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ جب شہزادی مجھے دیکھے گی۔ تو اپنا دل تھام لے گی۔ اور اس نے مجھ سے ملنے کی حسین آرزوؤں اور امیدوں کی جو فلک بوس عمارت تعمیر کر رکھی ہے وہ ایک پل میں مسمار ہو جائے گی۔ اس کا معصوم دل مجھ جیسے معمولی شکل کے انسان کے دیدار کی تاب نہ لا سکے گا۔ اس وقت جب کہ اس نے مجھے دیکھا نہیں۔ میری محبت اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے۔ جب وہ مجھے دیکھ لے گی۔ تو محبت کا طلسم ٹوٹ جائے گا"۔

---

۲ شاعر شہزادی کے وطن روانہ ہونے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ لیکن آنے سے پہلے اس نے شہزادی کو لکھ دیا کہ "ایک آدمی کے ہاتھ تمہیں چند تحفے بھیج رہا ہوں۔ اور دس پندرہ روز بعد خود بھی آجاؤں گا"۔

یہ خبر سن کر شہزادی کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اب سہیلیوں نے محسوس کیا۔ کہ اس کے چہرے سے غم کے آثار حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے ہیں۔ اور اس کے گالوں کی زردی کو سرخی چوم رہی ہے۔ اب وہ سہیلیوں سے مل کر تمام دن ہنستی اور طرح طرح

کے مذاق کرتی۔ اس کا ارادہ تھا کہ جب شاہو آئے تو اسے یا تو واپس ہی نہ جانے دیا جائے۔ یا بہت مدت تک مہمان رکھا جائے۔ لیکن اس تمام کارروائی کے لئے انتہائی رازداری کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے اس موقعہ پر اپنی دو رازدار سہیلیوں کی مدد کی ضرورت محسوس کی۔

ایک دن جب کہ لفکا ڈیو کے قاصد کو تحفے لے کر وہاں پہنچنا تھا۔ اس نے اپنی حسین اور شوخ سہیلیوں ایمی اور نوبل کو اپنے پاس باغ میں بلایا۔ اور کہنے لگی: "پیاری سہیلیو! میں نے ہمیشہ تمہیں ایک معتبر رازدار سمجھا ہے۔ اور کبھی کوئی بات تم سے نہیں چھپائی۔ یہاں تک کہ جب میرے چچا زاد بھائی نے زبردستی میرا منہ چوم لیا تھا۔ اور میں نے اسے تھپڑ لگایا تھا۔ تو سب سے پہلے یہ بات میں نے آکر تم دونوں ہی کو بتائی تھی۔ لیکن آج میں تم پر ایک ایسے راز کا انکشاف کرنے والی ہوں۔ جو شاید تمہارے لئے بہت حیرت بلکہ ممکن ہے صدمے کا موجب ہی ہو۔ اس راز کو میں نے اب تک اپنے دل کے عمیق ترین گوشے میں چھپا رکھا تھا۔ لیکن اب اس راز کے انکشاف کا وقت آگیا ہے۔ تم دونوں اپنے دل تھام لو۔ اور میری باتوں کو تحمل اور صبر سے سننے کی طاقت اپنے آپ میں پیدا کر لو۔ ممکن ہے۔ کہ اس راز کے انکشاف سے تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے۔ کہ تمہاری ان ستاروں کی سی چمکیلی اور پیاری پیاری آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں۔ لیکن اب پچھتانے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ جو ہونا تھا۔ وہ ہو چکا۔ بلکہ جہاں تک میرا خیال ہے۔ میں نے جو کچھ کیا۔ اچھا کیا۔ اور مجھے اپنے رویّہ پر کبھی پشیمانی نہیں ہوگی۔"

ایمی اور نوبل دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ شہزادی کے قریب آبیٹھیں۔ اور کہنے لگیں: "خدا خیر کرے۔ شہزادی جلد بتاؤ۔ وہ کون سی بات ہے۔ جس نے تمہیں اس قدر مضطرب کر رکھا ہے۔"

اس وقت شہزادی کی آنکھوں سے دو شفاف موتی گر کر خاک میں مل گئے۔ اور ایک سرد آہ بھر کر بولی: "پیاری ایمی اور پیاری نوبل! مجھے ایک غریب شاعر سے جس کے پاس رہنے کے لئے شاید اچھا مکان تک نہ ہوگا۔ محبت ہوگئی ہے۔ میں نے اسے دل دے دیا ہے۔ دل نہیں بلکہ اپنا جسم اور اپنی روح تک اس پر نثار کرنے کے لئے تیار ہوں۔ تم شاید یہ سوچو گی کہ میں نے اپنے آپ کو اس قدر سستا کیوں بیچ دیا۔ لیکن نہیں شاعر کے دل میں میرے لئے جیسی محبت موجود ہے۔ ویسی کسی مرد کے دل میں کسی عورت کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے خیالات پاکیزہ ہیں۔ اس کا دل مقدس ہے۔ اور اس کی نظمیں جو تم بھی کئی بار سن چکی ہو۔ رہتی دنیا تک زندہ رہینگی۔ پیاری سہیلیو! تمہاری شہزادی اپنے آپ کو ایک معمولی سے آدمی کے حوالے کر چکی ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ میرا درجہ خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ اس کی محبت کے درجے سے بلند نہیں۔ دنیا میں شاید میری کوئی قیمت ہو سکے۔ لیکن اس کی محبت انمول ہے۔ وہ پھولوں سے زیادہ حسین اور شہد سے زیادہ شیریں ہے۔"

ایمی اور نوبل بت بنی شہزادی کی باتیں سن رہی تھیں۔ جب شہزادی نے آخری فقرہ ختم کیا۔ تو دونوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور پھر شہزادی کے قدموں پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

ایمی کہنے لگے: "شہزادی! خدا کے لئے ایسا نہ کرو۔ شاہی خاندان کو بٹہ لگ جائیگا۔ تمہارے شاعر کا درجہ خواہ کس قدر بلند کیوں نہ ہو۔ خواہ وہ تم سے کس قدر محبت کیوں نہ کرتا ہو۔ لیکن میں اسے تمہارا محبوب نہ بننے دوں گی۔ میں اپنا کلیجہ نکال کر تمہارے قدموں پر رکھ دوں گی۔ اور دست بستہ رو رو کر تم سے التجا کروں گی۔ کہ شہزادی اپنی نگاہِ انتخاب اتنی حقیر ہستی کی طرف مبذول نہ کر۔ اپنا درجہ اتنا کم نہ کر۔ اس شاعر کو بھول جا.... بھول جا ہمیشہ کے لئے۔"

نوبل کہنے لگی۔ "شہزادی اتنے غریب شخص سے تو میں بھی کبھی محبت نہ کروں گی۔ اور تم تو ہماری شہزادی ہو۔ میں تو تمہیں چاند اور ستاروں کی نگاہوں سے بھی چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔ تم جیسی حسین شہزادی کسی فرشتے کو بھی پسند نہ کریگی۔ لیکن تم کیوں ایک ادنٰے سے انسان کے دام محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ بھول جاؤ..... بھول جاؤ اسے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ"

شہزادی اپنی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں گراتے ہوئے بولی: "پیاری سہیلیو! یہ بتاؤ کہ کبھی سایہ بھی انسان سے جدا ہوا ہے۔ کیا تم پھول سے خوشبو کو چھین سکتی ہو۔ کیا تم بجلی سے چمک دور کرسکتی ہو؟ میں نے اپنا دل جسے دے دیا۔ دے دیا۔ میں نے کئی راتیں اپنی محبت پر غور کرنے میں بسر کی ہیں۔ اور میں اس فیصلے پر پہنچی ہوں کہ میں کسی طرح بھی لفکاڈیو کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ تمہاری خاطر میں یہ کرسکتی ہوں کہ اس سے شادی نہ کروں۔ لیکن پھر بھی میں دنیا میں کسی اور انسان سے بھی شادی نہ کروں گی۔ اور محبت کا معاملہ ہی جدا ہے۔ میرے دل میں کسی دوسرے کی محبت کا خیال آنا اتنا ہی ناممکن ہے۔ جتنا چاند کے پاس تاریکی کا پہنچنا۔

"میری پیاری فاختاؤ! لفکاڈیو کا درجہ دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں سے زیادہ بلند ہے۔ اس کا قصور صرف اتنا ہے۔ کہ وہ غریب والدین کے گھر پیدا ہوا۔ لیکن اس کا دل اس کی روح اور اس کے خیالات شہنشاہوں سے بھی کہیں زیادہ بلند اور لطیف تر ہیں"

"میری پیاری سہیلیو! اس کی محبت پاک ہے۔ اور پاک محبت اس دنیا میں مفقود ہے۔ اگر یہ ہمیں کہیں سے دستیاب ہو جائے۔ تو ہمیں اس کی قدر کرنا چاہیئے۔ دیکھو! میں اسے ہزار مرتبہ بلا چکی ہوں۔ کہ وہ آ کر مجھ سے ملے۔ لیکن وہ دور ہی سے محبت کرنا چاہتا ہے۔ اس کی محبت میں ہوس کو کوئی دخل نہیں۔ وہ میرے اصرار پر بھی نہیں آتا

تھا۔ لیکن میری محبت کی کشش آخر سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے اس کے دل پر اثر انداز ہوئی۔ اور اب وہ مقناطیس کی طرح میری طرف کھنچتا چلا آرہا ہے۔ میں اسے کئی دن مہمان رکھوں گی۔ اگر تم میری خیرخواہ ہو۔ تو تم بھی میری طرح اس کی راہ میں آنکھیں بچھاؤ۔ اور اس کی خاطر مدارت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کرو۔ اس کا قاصد آج کچھ تحفے لے کر آرہا ہے۔ اور دس پندرہ دن تک وہ خود بھی آنے والا ہے۔"

شہزادی نے اپنی بات ختم ہی کی تھی۔ کہ جھاڑی میں سے ایک شخص نمودار ہوا۔ اور شہزادی کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ شہزادی حیران تھی کہ اس شخص نے بلا اجازت باغ میں آنے کی اور پھر شہزادی کے سامنے بے دھڑک آجانے کی جرأت کیسے کی۔ وہ چیں بجبیں ہو تی ہی تھی۔ کہ اجنبی نے اپنی جیب سے ایک ڈبہ نکال کر شہزادی کی طرف بڑھایا۔ اور کہنے لگا۔ کہ "میں لفکا ڈیو کا قاصد ہوں۔ یہ ڈبہ میرے مالک نے آپ کی طرف بھیجا ہے اور میں اپنی اس بے جا مداخلت کے لئے معذرت کرتا ہوں۔"

شہزادی ہنس کر بولی۔ "لفکا ڈیو کے قاصد کو شاہی باغ میں داخل ہونے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں۔"

(۳)

آسمان پر گھٹائیں چھا رہی تھیں۔ بادل کی گرج رہ رہ کے کھڑے کر رہی تھی۔ باغ میں تیز و تند ہواؤں نے شور مچا رکھا تھا۔ ایک قیامت خیز طوفان آنے والا تھا۔ شام کی تاریکی کو طوفان کی آمد آمد نے اور بھی زیادہ بھیانک اور سیاہ کر دیا تھا۔ یکایک بارش شروع ہو گئی۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ خوفناک طوفان قیامت برپا کرے، شہزادی اور اسکی سہیلیاں اپنے معزز مہمان کو ہنسی خوشی محل کے ایک پوشیدہ حصے میں لے گئیں وہاں اس کے سامنے انواع و اقسام کے لذیذ کھانے چن دیئے گئے۔ شہزادی اور اس کی سہیلیوں نے اس خیال سے کہ وہ لفکا ڈیو کا ہم وطن اور اس کا قاصد ہے۔ ایک ہی

دسترخوان پر اس سے مل کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہو کر شہزادی کی دونوں حسین سہیلیاں شہزادی کے گرد اس طرح چہکنے لگیں۔ جس طرح پھول کے گرد بلبلیں۔ شہزادی بھی آج بہت خوش تھی۔ آج شاعر نے اسے پہلی مرتبہ ایک ڈبے میں پھول بطورِ تحفہ بھیجے تھے۔ جو اگرچہ مرجھا چکے تھے۔ لیکن جس محبت سے وہ بھیجے گئے تھے۔ اس کی خوشبو اب تک ان میں سے آرہی تھی۔ ہنسی مذاق اور اس قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ لیکن معلوم نہیں اجنبی مہمان اس قدر پژمردہ اور مغموم کیوں نظر آرہا تھا۔ شاید اس نے چھپ کر وہ گفتگو سن لی تھی۔ جو اس کے آقا لفکاڈیو کے متعلق شہزادی اور اس کی سہیلیوں کے درمیان ہو رہی تھی۔

(۴)

باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی پُرشور ہواؤں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ اور ژالہ باری تو اس قدر شدید ہو رہی تھی۔ کہ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بندوق کی گولیوں کی بارش ہو رہی ہو۔ کبھی کبھی بجلی کے گرنے کی رونگٹے کھڑے کر دینے والی آواز بھی آجاتی۔ طوفان درختوں کی ٹہنیوں، اور درختوں کو جڑ سے اکھیڑ رہا تھا۔ لیکن اجنبی مہمان شہزادی اور اس کی سہیلیاں لاتعداد کافوری شمعوں کی چکاچوند پیدا کرنے والی روشنی میں بیٹھی چہلیں کر رہی تھیں۔ رات کافی گزر گئی تھی۔ لیکن انہیں نیند نہ آتی تھی شہزادی کا موضوعِ گفتگو بار بار لفکاڈیو کے متعلق کسی بات کی طرف پلٹ جاتا تھا۔ اس لئے اس مختصر سی ملاقات میں لفکاڈیو کے متعلق بیسیوں باتیں اجنبی سے پوچھ ڈالیں۔

آج شہزادی اور اس کی سہیلیوں کی آنکھوں میں نیند کوسوں دور تھی۔ وہ بار بار اجنبی سے کہتی "اگرچہ آپ سفر کی وجہ سے تھکے ہوئے ہوں گے۔ لیکن آپ کے آنے کی ہمیں اتنی خوشی ہے۔ کہ ہم آپ کو نہ سونے دیں گے۔ اور نہ خود سوئیں گے۔" اجنبی جواب میں مسکرا دیتا۔

نصف شب گزرے بھی کافی دیر ہو چکی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ طوفان ابھی

تک اسی زور شور سے جاری تھا۔ آخر کار شہزادی اپنے مہمان کو خوابگاہ میں پہنچا کر اپنے کمرے میں پھر سہیلیوں سے باتیں کرنے آبیٹھی۔

ایمی اور نوبل دونوں اس اجنبی کا مذاق اڑانے لگیں۔ اور کہنے لگیں " بھئی لفنگا ڈیو گا قاصد کس قدر اول جلول ہے۔ نہ اسے کوئی بات کرنی آتی ہے۔ بس منہ کو قفل لگائے اور منہ لبسورے اسی طرح بیٹھا رہا۔ جیسے ابھی ابھی بیوی کو دفنا کر آیا ہے "

ایمی شرارت سے ہنس کر کہنے لگی " شہزادی! اگر لفنگا ڈیو بھی ایسا ہی ہے۔ تو ہم کبھی اس کی خاطر مدارت نہ کریں گے۔ بلکہ اس کے سامنے تک نہ آئیں گے۔ آخر اس شخص نے اپنے منہ کو قفل کیوں لگا رکھا تھا "

نوبل کہنے لگی " اری ایمی! کیوں نہ تیری شادی اس سے کر دی جائے "

ایمی بولی " اس سے شادی کرنے سے تو بھینسے کی دلہن بن جانا زیادہ اچھا ہے۔ بہن میرا دولہا تو کبھی ایسی شکل کا نہیں ہو سکتا "

نوبل کہنے لگی " شہزادی تمہارا شاعر بھی ایسا ہی ہوگا۔ کیا تمہارے شاعر کے وطن کے لوگ اتنے ہی بدصورت ہوتے ہیں؟ "

شہزادی کہنے لگی " اری! یہ تو میرے شاعر کا کوئی خادم ہے۔ ہمارے محل میں ہماری بعض حبشی خادمائیں کس قدر بدصورت ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جوان خادماؤں کے آقا ہیں، بدصورت ہیں، میرا شاعر اس بھونڈی شکل کے آدمی سے کم از کم ایک لاکھ گنا زیادہ حسین ہوگا میرا دل کہتا ہے۔ کہ کوئی بدصورت شاعر اتنی اچھی نظمیں نہیں لکھ سکتا۔ نہ اس کے خیالات ایسے اچھے ہو سکتے ہیں۔ نہ اس کے خطوط اتنے اچھے ہو سکتے ہیں۔ کہ کوئی شہزادی انہیں سو سو بار پڑھنے پر مجبور ہو جائے "

اسی طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ اور اجنبی مہمان جسے اپنے متعلق باتیں سننے کا بہت شوق اور اضطراب تھا۔ اور جو پہلے بھی باغ میں شہزادی اور اسکی سہیلیوں کی گفتگو سن

کر مغموم ہو گیا تھا۔ دروازے کی اوٹ میں چھپ کر سب کچھ سنتا رہا۔ ہر بات اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام دے رہی تھی۔ شہزادی کی باتیں سن کر اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اپنے متعلق شہزادی اور اس کی سہیلیوں کی رائے سن کر یہ حساس شاعر جو قاصد بنکر اپنی محبوبہ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ دیوانہ سا ہو گیا۔ اسے یوں معلوم ہوا۔ جیسے محبت کا رفیع الشان قصر دھم سے زمین پر آ گرا ہے۔ اپنے دل کے چکنا چور ہونے کی آواز اس نے خود سنی اور اس نے اپنے آپ کو غم کے سمندر میں ڈوبتا ہوا محسوس کیا۔ اس کے لئے اپنی محبوبہ کے محل میں ایک پل کے لئے ٹھہرنا بھی مشکل ہو گیا۔ وہ دل ہی میں کہنے لگا کہ میرا دل ٹوٹ چکا۔ اب شہزادی کا دل نہ ٹوٹنے پائے گا۔

(۵)

ہوا چیخیں مار رہی تھی۔ آسمان سے پانی کی لہریں برس رہی تھیں۔ اور بجلی چمک چمک کر تاریک فضا کے سینے میں روشنی کے چمکدار خنجر گھونپ رہی تھی۔ بار بار رعد کی لرزہ آفریں کڑک سنائی دیتی۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا جیسے آسمان کا سینہ ابھی پھٹ جائے گا۔ ژالہ باری نے الگ قیامت برپا کر رکھی تھی۔

شاعر نے محل کو خیرباد کہی۔ اب اسے اپنی منزل کی خبر نہ تھی۔ اس کی صرف ایک ہی منزل تھی۔ اور اس منزل تک پہنچ کر وہ دل شکستہ ہو کر واپس آ رہا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ نہ اسے بارش کی پرواہ تھی نہ بجلی کا ڈر۔ نہ ژالہ باری سے خوف۔ بجلی بار بار چمک کر اسے بھیانک راستے دکھا رہی تھی۔ وہ چلتا گیا۔ چلتا گیا۔ نہ جانے کس طرف اور کہاں؟

یکایک بجلی چمکی اور شاعر کو اپنے سامنے ایک طوفان زدہ ندی نظر آئی۔ جو بارش کی وجہ سے بھوکی شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ شاعر نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائیں اور دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے۔ اس کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ کچھ الفاظ اس کی زبان پر آ آ کر

رہ گئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا۔ جیسے وہ خدا سے احتجاج کر رہا ہے۔ کہ اس نے اسے کیوں نہ دنیا کے بعض دوسرے انسانوں کی طرح خوبصورت بنایا۔

اس کے بعد یکایک آواز آئی "جوزیفائینا کے وطن کی ندی! جوزیفائینا سے میں ہم آغوش نہ ہو سکا۔ تو اس کے وطن کی ندی ہے۔ میں تجھ سے ہم آغوش ہوتا ہوں"

پانی میں چھلانگ لگانے کی آواز پیدا ہوئی۔ اور آندھی اور بارش کی مسلسل آواز میں گم ہو کر رہ گئی ——— جوزیفائینا کے وطن کی ندی نے اسے اپنے آغوش محبت میں چھپا لیا تھا۔

——— (۱۶) ———

صبح جب شہزادی اور اس کی سہیلیاں بیدار ہوئیں۔ تو یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کہ خوابگاہ سے مہمان غائب ہے۔ معمولی تلاش کے بعد مہمان کے متعلق شہزادی کی سہیلیوں کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا ہونے لگیں۔ اور وہ شہزادی سے کہنے لگیں۔ "ارے یہ اجنبی جاتے ہوئے کوئی قیمتی چیز تو اپنے ساتھ نہیں لے گیا" ——— لیکن وہ اپنے ساتھ ایک قیمتی اور نایاب چیز ضرور لے گیا تھا ——— یہ چیز شہزادی کے دل کی مسرت تھی۔

شہزادی نے شاعر کو خط بھیجا۔ پہلے ایک، جب اس کا جواب نہ آیا تو دوسرا پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ غرضیکہ شہزادی نے اپنے محبوب کو بے شمار خط لکھ ڈالے۔ لیکن پھر بھی ان خطوں کا جواب نہ آیا۔

شہزادی نے بھی شادی نہ کی۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھی ہو گئی۔ لوگ حیران تھے۔ کہ شہزادی شادی کیوں نہیں کرتی۔ لیکن اس راز سے صرف ایمی اور نوبل ہی واقف تھیں۔ جواب تک اس کی دو بوڑھی سہیلیاں تھیں۔

ستارہ

عالی مرتبت حکمران اور جرنیل نادر شاہ اپنے پُرشکوہ خیمے میں لیٹا تھا۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ان دنوں مغلوں کی عظیم الشان سلطنت اس کے چنگل میں بے دست و پا پڑی آخری ہچکیاں لے رہی تھی۔ فتح و نصرت کے شادیانے پکار پکار کر اس کے جاہ و مرتبہ کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ اس خیال میں مگن تھا۔ کہ عنقریب وہ سکندر اعظم کے مرتبے کو پہنچ جانے والا ہے ـــــــ اس وقت وہ ایک نئی ہی دنیا کی فتح کے پُرمسرت خواب دیکھ رہا تھا۔

وہ ترکی النسل تھا۔ اور اپنی فطری قابلیت اور سپاہیانہ شجاعت کی وجہ سے اس مرتبے کو پہنچ گیا تھا۔ کہ آج دنیا اس کا نام سن کر تھرّاتی تھی۔ اس کی مثال ایک ایسے خوفناک بگولے کی سی تھی، جو پورے جاہ و جلال سے اٹھا۔ اور ایک تاریک آندھی کی طرح ہر سمت چھا گیا۔ اور پھر ایسا مٹا کہ آج اس کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

جس وقت وہ اپنے تخت پر بیٹھا۔ ایران موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا، ترک افغان اور روسی سلطنت ایران کو زیر و زبر اور تباہ و برباد کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ ہر طرف فتنہ و فساد، سازش و بغاوت و تباہ کاری کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لیکن اس تباہی اور بے آئینی کے دور میں اس نئے حکمران نے اپنی خداداد قابلیت اور حسنِ تدبیر سے بہت جلد ملک میں امن و امان قائم کر لیا۔ اور اپنے جانثاروں کی مدد سے برّاعظم ایشیا کے لئے ایک دہشت بن گیا۔

انہی دنوں اس نے ہندوستان پر حملہ کر کے محمد شاہ رنگیلے کا ناک میں دم

کردیا۔ محمد شاہ رنگیلا اس کے لشکر میں صلح کی درخواست لے کر پہنچا۔ لیکن نادر شاہ نے اس کی تجویز کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ کیونکہ اس نے ایک مرتبہ نادر شاہ جیسے زبردست حکمران کی شان میں توہین آمیز کلمات کہے تھے۔

نادر شاہ سوچ رہا تھا۔ کہ کامیابی اور فتح ایک عجیب چیز ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب چیز انتقام ہے۔ انتقام فتح و نصرت سے زیادہ پُر لطف چیز ہے۔ اس خیال سے اس جنگجو اور زبردست حکمران کے ہونٹوں پر تبسم نمودار ہو گیا۔

اس نے فوراً احمد خاں قندھاری اور علی اکبر کو جو اس کے دو دانا وزیر تھے۔ طلب کیا۔ اور ان سے بحث کرنے لگا۔ کہ اس کی آئندہ راہِ عمل کیا ہونی چاہیئے۔ اس کی دلی خواہش تھی، کہ وہ محمد شاہ کے صوبجات پر قبضہ کر کے اُسے اور دق کرے۔ اور اذیت پہنچائے۔ سو محمد شاہ کو پہلے سے زیادہ ذلیل و رسوا کرنے کے لئے اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ جونہی اس کا لشکر تازہ دم ہوگا۔ وہ دار السلطنت دہلی پر حملہ کر دے گا۔ اور کچھ مدت تک شہر پر ایک فاتح کی حیثیت سے قابض رہنے کے بعد سلطنت محمد شاہ کے حوالے کر کے واپس چلا جائے گا۔ لیکن اس کا ایک مقصد اور بھی تھا۔ ان دنوں دہلی دولت کی کان بنی ہوئی تھی۔ جنگلوں میں مسلسل سفر کرنے کی وجہ سے اسے بے شمار اخراجات برداشت کرنے پڑے تھے۔ اور اس کی اپنی رعایا اس وقت محصولات کے بوجھ تلے بہت بُری طرح سے دب گئی تھی۔ اور اب وہ اسے اس سے زیادہ تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا۔ کہ آخر اس بوجھ کو شکست خوردہ حریف کے کندھوں پر کیوں نہ ڈال دیا جائے۔ علاوہ ازیں، وہ دہلی کو لوٹ کر اپنے آئندہ ارادوں کو بھی جامۂ عمل پہنانا چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

یکایک وہ چونک گیا۔ خیمے کے باہر کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک لمحے کے بعد خیمے کا پردہ اٹھا اور ایک خادم دست بستہ خیمے میں داخل ہوا۔ نادر شاہ کہنے لگا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

خادم جھک کر آداب بجا لایا۔ اور کہنے لگا "مغل شہنشاہ نے وہ تحائف بھیج دیئے ہیں۔ جن کا انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ ایک ہاتھی ہے۔ چند گھوڑے ہیں۔ پچاس غلام ہیں اور بہت سی خوبصورت ہندی عورتیں۔

نادر انگڑائی لے کر اٹھ بیٹھا۔ یہ تحائف بہت بے وقت پہنچائے گئے تھے۔ وہ شام سے دن کا منتظر تھا۔ اس وقت ہر طرف تاریکی پھیل چکی تھی۔ اور وہ تھکا ہوا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ہاتھی گھوڑوں کا معائنہ کل صبح کرے۔ لیکن عورتیں ——— وہ انہیں ابھی دیکھنے کا بہت خواہشمند تھا۔ اس نے ہندی حسن کی بہت تعریفیں سُن رکھی تھیں۔ احمد خاں نے اسے بتایا کہ ہندی عورتیں سرو کی مانند دراز قد ——— کی کی طرح نازک اور ہرن کی طرح شوخ ہوتی ہیں۔ ان کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی ہیں۔ اور جوانی میں مست غزالوں کی آنکھوں کو شرماتی ہیں۔ ان کا مخملیں سینہ آب نور سے دھلا ہوتا ہے۔ اور دراز زلفوں سے مشک کی خوشبو آتی ہے۔ احمد خاں قندھار کا باشندہ تھا۔ جو ہندوستان کے بالکل قریب ہے۔ اس لئے یقیناً وہ ہندی عورتوں کے متعلق بہت کچھ جانتا تھا۔

نادر نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا۔ اور اپنے خیمے سے نکل کر اس خیمے کی طرف چلا جس میں انہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ اس نے خیمے میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر میں معلوم کر لیا۔ کہ واقعی ہندی عورتوں کے حسن کی تعریف میں مبالغے سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ ان میں ایک سے ایک بہت زیادہ حسین تھی۔ مگر نادر کی نگاہیں صرف اس لڑکی کے چہرہ پر جم کر رہ گئیں۔ جو لڑکیوں کی قطار کے وسط میں کھڑی تھی ——— وہ بلند قامت اور نازک بدن تھی۔ اس کے رخسار انگاروں کی طرح سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے نہایت بے اعتنائی سے نادر شاہ کی طرف دیکھا اور نگاہیں نیچی کر لیں۔

نادر شاہ کہنے لگا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

ایک خواجہ سرا نے دست بستہ عرض کی "جہاں پناہ! یہ ایک راجپوت دوشیزہ ہے"
لڑکی نے خواجہ سرا پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالی۔ اور پھر ہنس کر نہایت بے باکانہ انداز میں کہنے لگی:- "دوشیزہ؟ یہ جھوٹ بک رہا ہے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔ اور میں لڑکی نہیں عورت بن چکی ہوں"

خواجہ سرا لڑکی کی گستاخی اور بے باکی پر غضبناک ہو گیا۔ اور ایک چابک لے کر اُن خوبصورت لبوں پر رسید کرنے کے لئے آگے بڑھا جن سے یہ گستاخانہ الفاظ نکلے تھے لیکن یکایک وہ پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ ستارہ نے کہ یہی اس شوخ پری کا نام تھا۔ اپنے میان سے ایک آبدار خنجر نکال لیا۔ اور اسے مارنے کے لئے آگے بڑھی۔ اس کے اس انداز سے شجاعت اور غیرت کا احساس نمایاں ہو رہا تھا۔

نادر قہقہہ مار کر ہنسا۔ اور ستارہ کی اس جرأت، بے باکی اور بہادری پر بہت خوش تھا۔ اور اسے مخاطب کر کے بولا "یہ خنجر مجھے دے دو"! لیکن ستارہ بالکل بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ اور اس نے نادر شاہ جیسے عظیم الشان بادشاہ کی طرف کوئی التفات نہ کیا۔

نادر نے پھر کہا۔ "یہ خنجر مجھے دے دو" ——— اس مرتبہ اس کے لہجے میں کچھ درشتی [illegible] آگئی۔

کچھ تامل کے بعد ستارہ نے خنجر اس کے حوالے کر دیا۔ نادر نے اسے اپنی کمر میں لگا لیا۔ اور منہ سے کوئی لفظ کہے بغیر عورتوں کی قطار کے سامنے سے گزر کر باہر چلا گیا۔

——— (۲) ———

خیمے میں واپس آکر نادر دیر تک خیالات کے سمندر میں غرق رہا۔ ستارہ کی دلکش ادا اسے کچھ ایسی بھا گئی تھی۔ کہ وہ اُسے دل سے محو نہ کر سکتا تھا۔ اب وہ اپنے خیمے میں بیٹھا اس خنجر سے کھیل رہا تھا۔ ایک خفیف سا تبسم اس کے لبوں پر نمودار تھا۔ اور

وہ سوچ رہا تھا کہ ستارہ کس قدر حسین ہے۔

نادر شاہ نے بڑی بڑی حسین عورتیں دیکھی تھیں۔ اور ان سے محبت بھی کی تھی لیکن ستارہ جیسی حسین اور دلکش عورت اس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ اس میں کم سے کم دس مردوں کی طاقت تھی۔ اور اس کا حسن! آہ وہ کس قدر لاجواب تھا۔ اس نے اپنی تمام زندگی میں ایسی چنچل، شوخ، بہادر اور حسین لڑکی نہ دیکھی تھی۔ معاً اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوتی ——— محبت کی چمک! اور اس نے ارادہ کر لیا۔ کہ وہ ایک مرتبہ پھر اسے دیکھے گا۔ اور اب کی اس سے تنہائی میں ملے گا۔

وہ کھڑا ہو گیا۔ اور خادم سے کہنے لگا۔ "آغا باشی کو فوراً یہاں بھیج دو"

خادم یہ الفاظ سنتے ہی حکم بجا لانے کے لئے دوڑا۔

تھوڑی دیر بعد آغا باشی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ ایک بلند قامت اور سنجیدہ مزاج حبشی تھا۔ نادر نے اس سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ تو وہ کچھ ملول سا ہو گیا۔ وہ ایک وفادار خادم تھا۔ اور ستارہ کی فطرت سے خوب آشنا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ کیا وہ ستارہ سے تنہائی میں مل سکے گا؟ کیا ستارہ اسے اپنے قریب آنے دیگی؟ کیا ستارہ جیسی ہرنی اس شکاری کے دام میں آسکتی ہے؟ آسمان کی بجلی کو چھونا تو شاید آسان ہو۔ لیکن کیا ستارہ کسی غیر مرد کو اپنا جسم چھونے کی اجازت دے سکتی ہے؟ اس نے نادر کی درخواست کے خلاف کچھ کہنا چاہا۔ لیکن نادر نے اسے فوراً ٹوک دیا۔ اور کہنے لگا۔

"اس لڑکی کو میرے پاس بھیج دو۔ میں ابھی اس سے ملنا چاہتا ہوں"

نادر اسے جاتے ہوئے بغور دیکھنے لگا۔ اور پھر خیمے میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا ——— رات کی خاموشی اور تاریکی پر اسے غصہ آرہا تھا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا۔ تو تاریکی کے پردوں کو اسی وقت اپنی تلوار سے پھاڑ دیتا ——— اس کی تاریکی کے پردوں کو جن کی وجہ سے اسے روشنی میں بھی ستارہ کا چہرہ صاف صاف نظر نہ آسکنے کا گمان تھا۔ تھوڑی

دیر بعد زحمتِ انتظار سے تنگ آ کر وہ ایک نشست پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔

یکایک پردہ اٹھا۔ اور غلام لڑکی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اندر داخل ہوئی فرطِ شرم سے اس کا سر جھک گیا تھا۔ لیکن اس کی چال سے ایک دلفریب شان نمایاں تھی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نادر حیرت اور سکوت کا مجسمہ بن کر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہیں اس کے حسین چہرے سے ہٹتی ہی نہ تھیں۔ وہ پہلے سے کئی گنا زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔

نادر کی آنکھیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اور شمعوں کی دھندلی دھندلی روشنی میں اس کا سادہ لباس اس کے حسن کو چار چاند لگا رہا تھا۔ وہ خیمے کے وسط میں آ کر چلتے چلتے رک گئی۔ اور چپ چاپ کھڑی رہی۔

نادر کہنے لگا۔ "میرے قریب آجاؤ۔ ذرا میری طرف تو دیکھو! تم خوفزدہ کیوں ہو رہی ہو؟"

ستارہ نے ایک زخمی چڑیا کی طرح اس کی طرف گھبرائی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ وہ سخت خوفزدہ ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ موت کے منہ میں جا رہی ہے۔ لیکن وہ موت کے منہ میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ گو ایک گھنٹہ پیشتر اسے اپنی زندگی کی ذرہ برابر بھی پرواہ نہ رہی تھی۔ لیکن اب ——— اب جب کہ اس نے اپنے زندہ رہنے کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ وہ زندہ رہنے کی متمنی تھی۔ آج تک اس کا شمار محل کی خوشامدی کنیزوں میں ہوتا رہا تھا۔ وہ اپنی مالکہ کے ہاتھوں میں اب تک کٹھ پتلی بنی رہی تھی۔ لیکن اس وقت وہ ایک ایسے بہادر مرد کے سامنے کھڑی تھی جس کے متعلق وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ ایک ایسے مرد کی متمنی تھی۔ جو طاقتور، شجاع۔ اور پُر عظمت ہو۔ اور اس وقت اس کے سامنے ایک ایسا ہی مرد کھڑا تھا۔ اس کی دلی خواہش تھی۔ کہ وہ اس وقت اپنے آپ کو نادر کے قدموں پر گرا دے۔ اور تا زیست اس کی خدمت گزاری کرنے کی قسم کھا لے۔ لیکن وہ اپنی محبت

کے معاوضے میں محبت کی طالب تھی۔ وہ اپنے آپ کو اس زبردست تاج کی خدمت گذار بننے کی اہل نہ سمجھتی تھی۔ لیکن اگر وہ اس کی رانی نہیں بن سکتی تھی۔ تو کم سے کم اس کی خدمت گذاری تو کر سکتی تھی۔ اور ضرورت کے وقت اس پر اپنی جان بھی قربان کر سکتی تھی۔ اس کے لئے یہی کافی تھا۔

نادر ایک جہاندیدہ اور معاملہ فہم انسان تھا۔ وہ فوراً اس لڑکی کے دل کا راز پا گیا۔ اور اسے معلوم ہو گیا۔ کہ لڑکی کے دل میں چند حسین راز انگڑائیاں لے رہے ہیں اب تک عورتوں نے دولت و ثروت اور جاہ و جلال کے لئے اس سے محبت کی تھی۔ مگر یہ عورت جو خود بہادر تھی۔ محض نادر شاہ کی بہادری کی وجہ سے اس پر نثار ہو رہی تھی۔ اور وقت پر اپنی جان نثار کرنے کے لئے بھی تیار تھی۔

نادر جانتا تھا۔ کہ اس قسم کی کوئی بات کہنے کے لئے اسے کافی جرأت اور حوصلے سے کام لینا پڑے گا۔ اس لئے اس نے نہایت ملائمت اور ملاطفت سے اسے تسلی دی اور یقین دلایا۔ کہ اس کا "قصور" معاف کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد نادر نے ستارہ سے اس کی زندگی کے حالات دریافت کئے۔ نادر شاہ کو معلوم ہوا کہ اس کے دل میں مغلوں کے لئے کوئی محبت موجود نہیں۔ اس نے نادر شاہ کو بتایا کہ وہ ایک راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئی۔ اور ابھی بچہ ہی تھی۔ کہ گرفتار ہو گئی اور ایک مغل سپاہی کے ساتھ بیاہ دی گئی۔ لیکن وہ اس کے گھر سے فرار ہو گئی۔ اور کئی حادثات سے دوچار ہونے کے بعد اسے مارواڑی تاجروں کے ایک قافلے میں پناہ ملی۔ وہ اسے دہلی لے آئے۔ وہاں شہنشاہ کی حرم اس پر مہربان ہو گئی۔ اور وہ آج تک اسی کی خدمت کرتی رہی۔

نادر کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد اس کی آواز میں ارزش پیدا ہو گئی۔ اور وہ جوش محبت سے کانپتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا تو میری ملکہ بننا پسند کرے گی؟ ستارہ

دیکھ اگر تو میری ملکہ بن گئی۔ تو ساری دنیا کی گردنیں تیرے آگے فرطِ احترام سے جھکیں گی"۔
ستارہ کی رگ رگ میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ یہ الفاظ نادرشاہ جیسے عظیم المرتبت بادشاہ نے اس کے لئے کہے ہیں۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ کہ اس کے کانوں نے یہ الفاظ سنے ہیں۔ وہ خیمے میں ایک مجرم کی حیثیت سے آئی تھی۔ لیکن ایک فاتح شہنشاہ اس کی طرف ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اور اسے دولت و عزت اور شان و شوکت کا ہدیہ پیش کر رہا تھا۔ یکایک وہ اٹھ کر نادرشاہ کے قدموں پر گر گئی۔ اور اس نے فرطِ محبت سے اس کے قدم چوم لئے ———— یہی اس کا جواب تھا۔

نادرشاہ نے اسے زمین پر سے اٹھا لیا۔ اور کہنے لگا" اب تم میری ملکہ ہو۔ اب تم لونڈی نہیں ہو۔ تمام دوسری عورتیں تمہارے قدم چومیں گی۔ تم اپنے آپ کو اس قدر ذلیل اور حقیر نہ سمجھو"

نادرشاہ نے آغا باشی کو حکم دیا۔ کہ وہ قاضی کو بلائے ———— تھوڑی دیر بعد ستارہ جو پہلے ایک معمولی کنیز تھی۔ اپنے وقت کے سب سے زیادہ پُرشوکت، بہادر، اور باعزت بادشاہ کی ملکہ بن گئی۔ اس کا لباس زر و جواہر سے جھلمل جھلمل کرنے لگا۔ اور اس کا حسن چاند اور ستاروں کو شرمانے لگا۔

یہ خبر بجلی کی سی سرعت سے تمام لشکر میں پھیل گئی۔ لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ لیکن ستارہ کو ان کی کیا پرواہ تھی۔ آج وہ بے حد مسرور تھی۔ نادرشاہ جیسے زبردست سپاہی کی محبت اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی تھی۔ نادرشاہ کے سوا اسے اور کسی کا خیال نہ تھا۔ نہ اس کے دل و دماغ میں اس وقت دوسرے خیالوں کے لئے کوئی گنجائش تھی۔

بعض اوقات وہ اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتی۔ لیکن وہ اس تنہائی میں بھی خوش تھی۔ وہ اپنے خیمے میں تنہا بیٹھی شام ہونے کی منتظر رہتی۔ نادرشاہ کو اس کے

پاس ایک بادشاہ کی طرح نہیں، بلکہ ایک شوہر کی طرح آتا۔ اور ساری رات اس کے ساتھ بسر کرتا۔ کوئی رات ایسی نہیں آتی تھی۔ جب وہ اس کے پاس نہ ہو۔

آہستہ آہستہ ستارہ نے لشکر کی دوسری عورتوں سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔ اور اس کے بدگمان رقیبوں کو رام کرنے کا یہی ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے کئی بدگمان رقیبوں کو رام بھی کر لیا۔ لیکن ان رقیبوں میں ایک عورت ایسی بھی تھی۔ جو ستارہ کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کینہ پرور اور کمینہ خصلت عورت کا نام شیرازی تھا۔ اس کے دل میں ستارہ کی سب خوبیاں، ہیچ تھیں۔ وہ نادر شاہ کی محبوبہ تھی۔ اور ستارہ کے آنے سے نادر نے اسے بالکل فراموش کر دیا تھا۔

شیرازی کے دل میں جذباتِ رقابت بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ ستارہ سے خوفناک انتقام لے گی۔ معصوم ستارہ کو معلوم نہ تھا۔ کہ اس کے خلاف ایک خوفناک سازش ہونے والی ہے۔ شیرازی نے مکاری کا ایسا جال بچھایا۔ کہ ستارہ اسے اپنی بہترین دوست سمجھنے لگی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ شیرازی ستارہ کی رازدار سہیلی بننے لگی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی۔ کہ اگر ستارہ کے راز اس کے ہاتھ آ گئے۔ تو آگے چل کر وہ ان سے بہت فائدہ اٹھا سکے گی۔ وہ ہر وقت ستارہ کی نقل و حرکت کی نگرانی کرتی رہتی۔ اور کوشش کرتی کہ ستارہ کا کوئی راز اس سے چھپا نہ رہ سکے۔

شیرازی کوئی ایسی ویسی معمولی عورت نہ تھی۔ وہ ایک اعلیٰ سردار کی بہن تھی۔ بیچاری ستارہ کو کیا معلوم تھا۔ کہ وہ آستین میں سانپ پال رہی ہے۔ اور اس دوستی کے پردے میں اس کے لئے کیسے کیسے مصائب و آلام اکٹھے کئے جا رہے ہیں۔ اور اگر اسے معلوم ہو بھی جاتا۔ تو کیا اسے اس کی پروا ہوسکتی تھی۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ ایسی عورت نہ تھی کہ ایسے مسئلوں کی طرف کوئی توجہ دے۔ اسے ایک ایسا محبوب مل گیا تھا۔ جس کے

خواب وہ مدتوں دیکھ رہی تھی۔ اور اس نے اسے اس طرح حاصل کر لیا تھا۔ جس طرح اس سے پہلے اور کوئی عورت اسے حاصل نہ کر سکی تھی۔

نادر کے مصاحب اس کے اس عشق پر بہت حیران تھے ـــــ وہ ستارہ کے لئے دیوانہ ہو گیا تھا ـــــ اور وہ چہ میگوئیاں کرتے تھے۔ کہ دیکھیں ہمارے بادشاہ کے اس نئے رومان کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

(۳)

نادر شاہ کے زبردست لشکر کو پڑاؤ ڈالے کتنی دن ہو چکے تھے۔ وقت پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ دن بتدریج تیزی سے گزرے جا رہے تھے۔ یکایک نادر کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ اگر کچھ دن اسی طرح اس کی فوج بیکار رہی۔ تو اس کا جوش سرد پڑ جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً دہلی کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔

حکم سنتے ہی کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اور شام تک خود بادشاہ بھی کوچ کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ شام کو حسب معمول ستارہ کے خیمے میں گیا تو مارے تکان کے اس کا بدن چور چور ہو رہا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہوا ہے۔ اس خیال سے کہ آج رات وہ پہلے کی طرح ستارہ کی محبت سے مالا مال نہ ہو سکے گا۔ اس نے ستارہ کی طرف حسرت اور محبت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ غمگین ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ اب اس کے سامنے بڑے بڑے اہم معاملات پیش ہونے والے ہیں۔ اور ان کا تعلق اس کی سلطنت اور جنگ سے ہے۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ کہ اس نے فوج کو اتنی جلدی کیوں کوچ کا حکم دے دیا۔ اور وہ اپنی ستارہ کی صحبت سے چند دن اور کیوں نہ لطف اندوز ہوا ـــــ عورت کی محبت ـــــ آہ! ایک عورت کی محبت کتنی زبردست چیز تھی۔ اس کی خداداد طاقت اور شجاعت سے بھی زیادہ پُراثر!

ستارہ بھی اس کے دل کا راز پا گئی۔ اور بادشاہ کے غم کو دور کرنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔ وہ اس کے غم کا راز معلوم کرنے کے لئے بےتاب ہو گئی۔ نادر نے اسے اپنی پگڑی سے ایک بیش قیمت ہیرا نکال کر دیا۔ اور کہنے لگا "میں یہ ہیرا تحفے کے طور پر تمہیں دیتا ہوں۔ اگر تم کو کبھی مجھ سے خود ملنے کی ضرورت پیش آئے تو یہ ہیرا بھیج دینا۔ میں جہاں بھی ہوں گا۔ فوراً آجاؤں گا۔ یا تمہیں اپنے پاس بلا لوں گا۔"

اب ستارہ کو معلوم ہوا۔ کہ وہ کیوں اس قدر غمگین تھا۔ اس نے اس سے ہیرا تو لے لیا۔ لیکن یہ بات اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ کہ کبھی اسے ہیرا بھیج کر نادر کو بلانے کی ضرورت پیش آئے گی۔

ستارہ کو یہ واقعہ ایک خواب کی طرح محسوس ہوا۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے تھوڑی دیر کے لئے اس کی مسرت کی دنیا پر غم کے بادل چھا گئے ہیں۔ دوسرے دن فوجوں نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ ستارہ کے لئے یہ سفر انتہائی حیرت اور تعجب کا موجب تھا۔ اس نے سفر کے دوران میں ہر لمحہ میں زیادہ سے زیادہ لطف اٹھایا۔ وہ اپنے محبوب کے پہلو میں ایک گھوڑے پر سوار تھی ——— ایک ملکہ بن کر ——— چنانچہ وہ بڑی شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ شہر دہلی میں داخل ہوئی۔

اس کی زندگی کے یہ لمحات شیریں بھی تھے۔ اور تلخ بھی۔ شیریں اس لئے کہ دہلی سے اسے ایک قیدی اور لونڈی کی حیثیت سے نکالا گیا تھا۔ لیکن اب وہ شاہی محل میں ایک فاتح ملکہ کی حیثیت سے ٹھیری ہوئی تھی۔ اس کے گرد عیش و عشرت کا وہ تمام سامان موجود تھا۔ جو ایک زبردست بادشاہ کی ملکہ کے پاس ہونا چاہیئے۔ اور تلخ اس لئے کہ اس کا شہر اجڑ جانے والا ہے۔

دوسرے روز مغل ملکہ جس کے محل میں کبھی ستارہ نے ایک کنیز کی حیثیت سے اپنی زندگی کے دن کاٹے تھے۔ اس سے ملاقات کرنے کے لئے حاضر ہوئی۔ ملکہ نے ستارہ سے

دست بستہ التجا کی کہ وہ خدا را اپنے رسوخ اور اقتدار سے کام لے کر شہر کو تباہی اور بربادی سے بچا لے۔ ستارہ نے بڑی خوشی سے ملکہ کی یہ درخواست منظور کر لی۔ اس نے سوچا کہ جب زمانہ میرے ساتھ وفا کر رہا ہے۔ تو مجھے بھی خلق خدا پر رحم کرنا چاہیئے۔

جب نادر رات کو اس کے خیمے میں آیا۔ تو ستارہ نے کہا۔ کہ "میں مغل ملکہ سے وعدہ کر چکی ہوں۔ کہ میں تمہارے شہر کو تباہی اور بربادی سے بچا لوں گی۔ کیا آپ اپنی فوجوں کو حکم دیں گے کہ وہ شہر میں بے گناہوں کا خون نہ بہائیں۔ اور لوٹ مار نہ مچائیں۔ مجھے اپنا شہر اور اپنے شہر کے باشندے بہت ہی عزیز ہیں۔"

بادشاہ اس کی درخواست سن کر مسکرانے لگا۔ کہ "میں پہلے ہی فوج کو حکم دے چکا ہوں۔ کہ وہ ستارہ کے شہر میں تباہی نہ مچائیں۔ اور نہ لوگوں کو لوٹیں۔ اور لشکر نے میری بات مان بھی لی ہے۔ کیونکہ اب اسے شہر والوں کی طرف سے حملے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ آج کی شکست نے ان کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ اور اب وہ ہمارے لشکر پر حملہ نہیں کر سکتے۔"

لیکن نادر کا قیافہ صحیح نہ نکلا۔ چند دن بعد جب ستارہ اپنے کمرے میں بیٹھی نادر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے چیخ و پکار اور شور کی المناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سوچا کہ شاید نادر کو اپنے وعدہ کا خیال نہیں رہا۔ اور اس نے شہر پر حملہ بول دیا ہے۔ اور غریب باشندوں پر فوج ظلم ڈھا رہی ہے۔ پھر اسے خیال آیا۔ کہ نہیں نادر مجھ سے کیا ہوا وعدہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ لیکن یہ المناک صدائیں سن کر اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے آغا باشی کو بلا کر پوچھا۔ کہ کیا معاملہ ہے۔ آغا باشی نے جواب دیا۔ "کہ شہر والوں نے فساد برپا کر دیا تھا۔ اور اب انہیں اپنے کئے کی سزا مل رہی ہے۔"

"سزا مل رہی ہے"! ستارہ نے آہستہ سے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ نادر کے نزدیک

سزا دینے کا مفہوم کیا ہے۔ اس نے فوراً نادر کو پیغام بھیجا کہ وہ خدا کے لئے لشکر کو روکے اور
شہر والوں پر رحم کھا کر انہیں تباہی سے بچا لے۔ لیکن بہت دیر تک نادر کی طرف سے اُسے
کوئی جواب موصول نہ ہُوا۔ آخر بڑی مایوسی کے بعد اب ستارہ نے نادر کے پاس وہ ہیرا بھیجا
لیکن پھر بھی قتلِ عام بند نہ ہُوا۔ وہی چیخیں، وہی نالے اور وہی بین اب بھی سنائی
دے رہے تھے۔ نادر کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ تو ستارہ نے خیال کیا کہ شاید
نادر اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ اور اس نے ایک ایسے معاملے میں دخل دیا ہے جس میں
دخل دینے کا اسے کوئی حق نہ تھا۔ بچاری ستارہ بے حد مغموم اور اداس ہو گئی۔ کہ خواہ مخواہ
اس نے ایک ایسی درخواست کی جو رد کر دی گئی۔ لیکن وہ صحیح حالات سے ناواقف تھی۔
وہ نہیں جانتی تھی۔ کہ اس کی التجا تمام دن نادر کے پیشِ نظر رہی ہے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ نادر
نے پل بھر میں شہر کو پھونک کر نہ رکھ دیا۔ اور سڑکوں اور گلیوں میں خون کی ندیاں نہ بہائیں
ورنہ نادر اپنے حریفوں اور مخالفوں کے بچے بچے تک کو موت کے گھاٹ اُتار دینے کا عادی
تھا۔ فوج کے سردار اس کے صبر و تحمل پر حیران ہو رہے تھے۔ کہ وہ باغیوں کو سزا دینے
میں بہت رک رہا تھا۔ وہ حیران تھے۔ کہ نادر اور یہ تحمل؟ اور ستارہ کو اس وقت تک یہ
حقیقت معلوم نہ ہوئی۔ جب تک کہ نادر نے رات کو خود آ کر ساری بات نہ بتائی۔

جب ایرانی لشکر نے دہلی کی بے شمار دولت سے مالا مال ہو کر شمال کا رخ کیا۔ تو
ستارہ نے محسوس کیا کہ اب اس کے لئے ایک نئی زندگی کی ابتدا ہوئی ہے —— ایک
ایسی زندگی کی جس میں ماضی کا ہر دکھ اور ہر لمحے کی یاد ایک دلکش مستقبل میں تبدیل ہو
سکے۔

اب اس کے سامنے ایک ایسی راہ تھی۔ جو ایک اجنبی ملک کو جاتی تھی۔ ایک ایسے
ملک کو جو اس کے لئے نئی قوم نئے لوگ اور نئے تصورات کا مرکز بننے والا تھا۔ وہاں
کے شدید خطرات بھی اس کے پیشِ نظر تھے۔ لیکن ستارہ کسی خطرے سے ڈرنے والی لڑکی

نہ تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ اب اس کا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑنے والا ہے۔ جو اس کے سخت دشمن ہیں۔ اور اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ایک امید پر ان خطرات کو مول لے رہی تھی۔ اور وہ امید تھی۔ نادر کی محبت اور اس کی صحبت! نادر اس کے پہلو میں ایک بہادر ساتھی کی طرح سوار تھا۔ اسے کسی قسم کا خوف نہ تھا۔ آج اس کی پگڑی کے سامنے وہ عظیم الشان اور لاجواب ہیرا چمک رہا تھا۔ جس کا نام "کوہ نور" تھا۔ اور جو آج کل برطانیہ کے شہنشاہ کے تاج کی زینت ہے۔

سفر کی کٹھن منزلیں طے کرنے کے بعد لشکر دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گیا۔ یہاں آکر نادر نے فوج کو آرام کرنے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ تھا۔ کہ درہ خیبر کو عبور کرنے کے لئے یوسف زئیوں کے علاقے سے گزرے۔ اس مقصد کے لئے وہ شمال کی طرف مڑا۔ تمام دن قبائل کے سرداروں سے گفت و شنید کرنے میں بسر ہوا۔ شام کو تکان سے چور چور ہو کر وہ واپس آیا اور آتے ہی سو گیا۔

آج کی رات بہت گرم تھی۔ اور یہ جگہ جہاں ان لوگوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ بہت ویران تھی۔ ہر طرف موت کا سا سکوت طاری تھا۔ کسی درخت کے پتے کی سرسراہٹ تک سنائی نہ دیتی تھی۔ ستارہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ اپنے محبوب کے خیالات میں غرق اپنے بستر پر لیٹی تھی۔ اپنے محبوب سے محبت کرنے کے شیریں خیالات نے اس کی خوبصورت آنکھوں سے نیند چھین لی تھی۔

یکایک وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے خیمے کے قریب کسی آدمی کی آمد کا احساس ہوا اور وہ نہایت احتیاط لیکن دلیری سے دبے پاؤں اپنے خیمے کے دروازے کے پاس پہنچی۔ اور دروازے سے باہر اس نے ایک گہری ہوئی نگاہ ڈالی۔ چند لمحات تک تو اسے کچھ نظر نہ آیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے نظر آیا کہ کوئی آدمی پیٹ کے بل رینگتا ہوا اس کے خیمے کی طرف آرہا ہے۔ اس کے بعد اسے اندھیرے میں تلوار کی چمک دکھائی دی

جس سے اس کے شک کو اور بھی تقویت پہنچ گئی۔ وہ خیمے میں واپس آئی۔ اور عین اس وقت جب کہ قاتل نادر پر ٹوٹ پڑنے کو تیار تھے۔ اس نے نادر کو بیدار کر دیا۔ لیکن قاتلوں کو پتہ چل گیا۔ کہ کسی نے نادر کو جگا دیا ہے۔ اور وہ بھاگ نکلے۔ نادر باہر آیا۔ تو اس نے دیکھا کہ اس کے محافظ مردہ پڑے ہیں۔ ستارہ واقعی سچی تھی۔ اس نے اپنے محبوب کو وقت پر جگا کر اسے موت کے منہ سے نکال لیا تھا

شیرازی ابھی تک ستارہ کے درپے آزار تھی۔ اس نے ستارہ کو ابھی تک معاف نہ کیا تھا۔ اور معاف کرتی بھی کیوں؟ وہ عورت تھی۔ اور جس عورت کا محبوب کوئی دوسری عورت چھین لے پہلی عورت اسے کبھی معاف نہیں کیا کرتی۔ شیرازی اس دوران میں کبھی انتقام لینے کے خیال سے غافل نہ رہی تھی۔ اور سازش بھی اسی کی کارستانی تھی۔

(۴)

بالآخر نادر شاہ ہرات پہنچ گیا۔ یہاں قاصدوں نے آ کر اسے یہ خوشخبری سنائی۔ کہ ولیعہد سلطنت اس کے استقبال کے لئے آ رہا ہے۔ اور وہ کل صبح تک نادر کے لشکر سے آ ملیگا نادر اپنے بیٹے سے ملاقات کرنے کے لئے بہت مضطرب تھا۔ اسے اپنے نور نظر اور لخت جگر سے ملے دو سال کا طویل عرصہ ہو چکا تھا۔ نادر نے خیال کیا کہ اس عرصے میں وہ ایک جوانمرد اور بہادر سپاہی بن چکا ہوگا۔ اسے اسکے متعلق جتنی بھی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ وہ مسرت بخش تھیں۔ اسے بتایا گیا۔ کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا حاکم اور جنگجو سپاہی ثابت ہوا ہے۔ اور صحیح معنوں میں شہنشاہ کا وارث یا ولی عہد کہلانے کا مستحق ہے۔

لیکن افسوس کہ صبح جب باپ بیٹا ایک دوسرے سے ہمکنار ہوئے تو یکایک نادر کو ایک خیال آ گیا جس نے اس کی تمام خوشی خاک میں ملا دی۔ یہ خیال وہ فطری

بدگمانی تھی۔ جو اکثر بادشاہوں کے دلوں میں اپنی اولاد کے متعلق پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس نے سوچا کہ کہیں شہزادہ خود مختار تو نہیں ہو گیا۔ اور کہیں وہ اس کا مددگار ثابت ہونے کی بجائے اس کی راہ کا کانٹا تو نہیں بن جائے گا؟ اس خیال نے کہ وہ لوگوں میں ہر دلعزیز ہے۔ اسے پہلے سے بھی زیادہ مشوش کر دیا۔ اس نے اپنی اس بدگمانی کو چھپانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ ادھر ولی عہد رضا قلی کے دل میں بھی یہ خیال پیدا ہوا۔ کہ بادشاہ کی اس آمد سے اس کے اقتدار میں فرق آ جائے گا۔ اور اب اسے ماتحتی کی زندگی گزارنی پڑے گی۔ اور اپنے باپ کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ وہ یہ برداشت کر سکے گا۔ کہ اتنا عرصہ خود مختاری کی زندگی گزار کر اب ایک دوسرے شخص کے تابع فرمان ہو کر زندگی گزارے۔ نادر ان تمام باتوں کا تصفیہ اپنے بیٹے سے کرنا چاہتا تھا۔ اپنے بیٹے کی دل کی باتوں سے وہ واقف تھا۔ اور جب تک یہ تمام باتیں طے نہ ہو جاتیں۔ باپ بیٹے کا رشتہ موزوں استوار نہیں ہو سکتا تھا۔

سو نادر اپنے بیٹے سے ملاقات کر کے خوش ہونے کی بجائے رنجیدہ ہو گیا۔ اب نیک دل ستارہ یہ کوشش کرنے لگی۔ کہ کسی طرح باپ بیٹے میں صلح ہو جائے۔ اور اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے اس نے ہر امکانی کوشش صرف کر ڈالی۔

ستارہ ایک ہندی عورت تھی۔ جو اپنے شوہر کے علاوہ اپنے شوہر کے ہر رشتہ دار کی عزت کرنا اور اس کی بھلائی چاہنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ اس نے اپنی نیک دلی سے مجبور ہو کر اپنا فرض ادا کیا۔ لیکن نادر کو اس کی یہ دخل اندازی پسند نہ آئی۔ اور وہ اس سے ناراض ہو گیا۔ اس نے ستارہ کے لئے کیا کیا کچھ نہ کیا تھا؟ اسے توقع تھی کہ وہ اس لئے میں اندھا دھند اس سے ہمدردی کرے گی۔ اور اس وقت وہ ایسی ہمدردی کی ضرورت بھی محسوس کر رہا تھا۔

یکایک نادر کے دل میں شکوک وشبہات اور بدگمانی پیدا ہوگئی - اور وہ سوچنے لگا کہ ستارہ آخر کیوں ہم دونوں کی صلح کرانا چاہتی ہے ——— ایک خوفناک خیال بجلی کی طرح اس کے دل ودماغ میں دوڑ گیا - اور سوچنے لگا کہ "کیا ولیعہد نے ستارہ کو رشوت وغیرہ دے کر تو اپنے ساتھ نہیں ملالیا - یا کسی خاص وجہ کی بنا پر ستارہ اس کی طرفدار تو نہیں ہوگئی - کہیں وہ اس سے غداری تو نہیں کر رہی - کہ ایسا بھی زمانے میں ہوتا آتا ہے" لیکن نہیں نہیں" وہ اپنے دل میں کہنے لگا "ستارہ مجھ سے کبھی دھوکا نہیں کر سکتی"

بہر حال رفتہ رفتہ ستارہ کے متعلق شکوک وشبہات اس کے دل میں پیدا ہو چکے تھے - جو عشق پیچاں کی بیل کی طرح پھیلنے لگے - اس نے سوچا کہ ستارہ ایک ہندوستانی عورت ہے - اس کا دل وحشی مغل یا ترک عورتوں کی طرح پتھر کا نہیں - اور محض نیکدلی کی بنا پر وہ باپ بیٹے میں سمجھوتہ کرا رہی ہے -

اب شیرازی کے ہاتھ ایک نادر موقعہ آیا - وہ اپنا انتقام لینے کے لیے ہر وقت منتظر رہتی تھی اور انتقام کی تجویزیں سوچتی رہتی تھی - جب اس نے دیکھا کہ وہ نادر موقع ہاتھ آگیا ہے - جس کی وہ مدتوں سے متلاشی تھی - اور جس کے حاصل کرنے کے لیے وہ اتنے طویل عرصہ سے مکاری کا جال پھیلا رہی تھی - تو اس نے نادر کی محبت از سر نو حاصل کرنے کی ٹھان لی - اور اس مقصد کے لئے یہ موقع بہترین تھا - آخر اس کے پاس نسوانی حسن وجمال کا جادو بھی تو تھا - اور کبھی اس نے بھی اپنے تبسم سے بادشاہ کے دل پر بجلیاں گرائی تھیں - کبھی سلطان کی بانہوں کے ہار اس کے گلے میں بھی پڑے تھے - وہ کوئی معمولی عورت نہ تھی - چنانچہ اس نے آہستہ آہستہ نہایت سلیقہ سے طرح طرح کے طریقوں سے اس محبت کو غصب کرنا شروع کر دیا - جو سلطان کے دل میں ستارہ کے لئے موجود تھی -

ستارہ ان سازشوں سے بالکل بے خبر تھی - وہ یہ دیکھ کر بہت کڑھتی تھی -

کہ بادشاہ اب بدل کیوں گیا ہے؟ اب وہ غمگین کیوں رہتا ہے؟ اب وہ اس سے پہلے کی طرح کیوں نہیں پیش آتا۔ کہیں وہ اس سے ناراض تو نہیں ہو گیا۔ آخر اس نے ایک دن فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ رات کو ضرور اپنے محبوب سے دریافت کرے گی۔ کہ اب وہ اس سے بیزار کیوں رہتا ہے۔ لیکن افسوس کہ اس رات نادر ستارہ کے پاس نہ آیا۔ اور وہ دیر تک بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی۔ جب وہ مایوس ہو گئی۔ کہ اب وہ نہیں آئے گا۔ تو وہ اپنے بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور ادھر دوسری طرف سے شیرازی کے ہنسنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یکایک اس پر ایک خوفناک حقیقت آشکارا ہو گئی۔ اور وہ بستر سے اٹھ کر فرش پر آ گری۔ اور رو رو کر اس نے اپنا برا حال کر لیا۔ یہاں تک کہ نیند نے اسے اپنے آغوش میں پناہ دی اور وہ سو گئی۔

شیرازی ابھی مطمئن نہ ہوئی۔ نادر کی محبت کے مدھم شعلوں کو پھر سے تیز کرنا ہی اس کا کام نہ تھا۔ بلکہ اس کے ساتھ اپنی رقیبہ کو بھی تباہ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ستارہ کو تباہ حال کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اور وہ ابھی تک اپنی بات پر قائم تھی۔ اس کے ارادوں میں ابھی تک لغزش نہیں آئی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی فطری مکاری کو کام میں لاتے ہوئے ولیعہد کے تمام راز معلوم کر لیے۔ اور پھر اس کی تفصیل حرف بحرف سلطان سے کہہ سنائی۔ اس کی یہ تدبیر بہت کارگر ہوئی۔ انہی مکاریوں سے اس نے نہ صرف اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا۔ بلکہ نادر کو ستارہ سے کافی حد تک بدظن بھی کر دیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ستارہ اب بھی نادر کو بہت عزیز تھی۔ حالانکہ کوئی ایسی کمینہ حرکت باقی نہ تھی جو شیرازی نے ستارہ کے خلاف نہ کی ہو۔

چند روز بعد پھر کسی نے بادشاہ پر قاتلانہ حملہ کیا۔ وہ ایک ندی کو عبور کر رہا تھا۔ کہ کسی نے چھپ کر گولی چلائی۔ پہلی گولی کی آواز سنتے ہی ستارہ جھٹ اپنے محبوب کے سامنے آ گئی۔ یعنی اس سمت میں نادر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جدھر سے گولی آئی تھی۔

اور اس نے دوسری مرتبہ اپنی جان پہ کھیل کر نادر کی جان بچائی۔ لیکن آہ نادر نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ اسے اس وقت اس قدر غصہ آ رہا تھا۔ کہ اس نے نہ ستارہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور نہ یہ سوچا کہ ستارہ نے اس پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلے ملزم کو تلاش کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا چاہیئے۔ اور دنیا کو دکھانا چاہیئے کہ نادر پر حملہ کرنے کا کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

شیرازی نے اپنی روایتی عیاری سے کام لیتے ہوئے نادر سے وعدہ کیا۔ کہ حملہ آور کی تحقیقات کرنے میں وہ نادر کی مدد کرے گی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔ اور چند ایسی جھوٹی شہادتیں دلوا دیں جن سے ثابت ہوتا تھا۔ کہ اس پر قاتلانہ حملہ ولی عہد کے ایما سے کیا گیا ہے۔

نادر کے لئے اس راز کا انکشاف بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ وہ سوچتا تھا۔ کہ یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ میرا لختِ جگر مجھ کو قتل کرانے کی کوشش کرے۔ اسے کسی طرح اس بات پہ یقین نہیں آتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود شیرازی کی مہیا کی ہوئی عینی شہادتوں کو بھی وہ نہیں جھٹلا سکتا تھا۔ چنانچہ شیرازی نے آہستہ آہستہ اسے یقین دلا دیا کہ اس معاملے میں ولی عہد کا ہی ہاتھ تھا۔ اور اس نے نادر شاہ کے دل میں ایک اس سے بھی زیادہ خوفناک شبہ پیدا کر دیا۔ اور وہ یہ کہ ولی عہد اپنے باپ کی ملکہ ستارہ پر دل و جان سے عاشق ہے۔ اور ستارہ کو بھی اس نوجوان سے محبت ہو چکی ہے۔

بدگمانی، غصے اور غرور نے نادر شاہ کو دیوانہ کر دیا۔ اس کے لئے یہ بات بیٹے کی غداری اور اس پر قاتلانہ حملہ کرانے کی کوشش سے کہیں زیادہ خوفناک تھی۔ وہ ان حلفی شہادتوں کو کیونکر جھٹلا سکتا تھا۔ جو اس کی ہمدرد ملکہ شیرازی نے بہم پہنچائی تھیں آخر نادر کے دل میں محبت، اور انتقام کے جذبات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہو گئے۔ اس کے خلاف ایک خوفناک جرم ثابت تھا۔ جو کسی حالت میں بھی قابلِ معافی نہ تھا

اور جس کے لئے صرف موت کی سزا ہی کافی ہو سکتی تھی۔ لیکن کیا وہ اپنے پیارے بیٹے کو موت کے گھاٹ اتار سکتا ہے؟ نہیں ——— سنگدل نادر اس خیال سے لرز اٹھا۔

بہر حال نادر نے فیصلہ کر لیا۔ کہ ولیعہد کو کچھ نہ کچھ سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ ایک ایسی سزا جو ہمیشہ کے لئے کمزور اور بے بس کر دے۔ یکایک اسے خیال آیا کہ شہزادے کی آنکھیں نکلوا دینی چاہئیں۔ اور پھر اسے جلا وطن کر دینا چاہیئے۔ نادر کے دل میں یہی ایک سزا تھی جو ولیعہد کے جرم کا جواب ہو سکتی تھی۔ اور یہ سزا جو موت سے بھی زیادہ ہولناک تھی۔ نادر کو بہت معمولی معلوم ہوتی تھی۔ اور یہ سوچ کر کہ یہ سزا ستارہ کے لئے بھی عبرت آموز ہو گی۔ نادر خوش ہوا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ کہ کیا ستارہ اب بھی .... کیا وہ اندھے محبوب سے ....؟

نادر نے اپنے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دینے کا فیصلہ کر دیا۔ اور شیرازی کا دل مسرت سے باغ باغ ہو گیا۔ وہ انتہائی مکاری اور عیاری سے اپنے منصوبے کام میں لا رہی تھی۔ اب وہ بدنصیب شہزادے کی ماں کے پاس گئی۔ اس سے بہت ہمدردی ظاہر کی اور بولی "افسوس میں اب کچھ نہیں کر سکتی۔ بادشاہ پر اب میرا کوئی اثر نہیں رہا۔ ہاں اگر ستارہ چاہے تو تمہارے بیٹے کی جان بچا سکتی ہے"۔

ان الفاظ نے غمزدہ ماں کی ڈھارس بندھا دی۔ اور وہ فوراً روتی ہوئی اپنی ستارہ کے پاس پہنچی، اور اس سے کہنے لگی "خدا کے لئے میرے لال کی جان بچا لے"۔

ستارہ نے اس کی باتیں بڑے غور اور ہمدردی سے سنیں۔ اور کہنے لگی۔ کہ اگرچہ مجھے امید نہیں کہ بادشاہ میری درخواست مانے۔ لیکن میں اپنی طرف سے انتہائی کوشش کروں گی۔ کہ کسی طرح بادشاہ کا حکم ٹل جائے۔ اگرچہ میں جانتی ہوں۔ کہ اس وقت بادشاہ سے رحم کی درخواست کرنا حماقت ہے۔ اور میری منت سماجت کسی کام نہیں آسکتی

لیکن میں اپنا فرض ضرور ادا کروں گی "
چنانچہ اس نے انتہائی جرأت اور دلیری سے کام لے کر نادر سے ملنے کی درخواست کی۔ جو منظور کر لی گئی۔ جب وہ خیمے میں داخل ہوئی۔ تو اس وقت نادر تنہا بیٹھا تھا اس کے چہرے پر وحشت اور درشتی کے آثار نمایاں تھے۔ اس نے ستارہ کے آنے کا مطلب سمجھ لیا۔ اور جب ستارہ نے ولی عہد کے لئے اس سے رحم کی درخواست کی۔ تو نادر کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ درشت اور غمگین ہو گیا۔
اپنے بیٹے کو سزا دینے کے خیال سے اُسے خود صدمہ پہنچ رہا تھا۔ لیکن ستارہ کا اس فیصلے کے خلاف درخواست کرنا اسے سخت ناگوار معلوم ہُوا۔ اور اسے یقین ہو گیا۔ کہ اس کا شک غلط نہیں تھا۔ ستارہ واقعی میرے بیٹے سے محبت کرتی ہے۔ شیرازی کی باتیں یکے بعد دیگرے اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ اور اسے پورا پورا یقین ہو گیا۔ کہ ولی عہد کو ستارہ سے اور ستارہ کو ولی عہد سے محبت ہے۔ اور وہ اسے بچانے کے لئے اس سے التجائیں کرنے آئی ہے۔ اپنی محبوبہ کی بے وفائی کے احساس سے اُسے اس قدر صدمہ ہُوا۔ جتنا اس سے پہلے کبھی نہیں ہُوا تھا۔ تھوڑی دیر تو خاموش رہا۔ اس کے بعد یکایک غضبناک لہجے میں بولا۔ " دور ہو جا یہاں سے ! ورنہ میں تجھے بھی اندھا کر دوں گا "
ستارہ اس کا بازو تھام کر کہنے لگی " میرے آقا ! رحم کرو ! رحم ! ! آخر وہ تمہارا بیٹا ہے۔ اسے کوئی اور سزا دے دو۔ میرے آقا ! میں تم سے منت کرتی ہوں۔ کہ اسے اندھا نہ کرو "
یہ فقرات نادر کی قوتِ برداشت سے باہر تھے۔ اس کا غم خوفناک غصے میں تبدیل ہو گیا۔ وہ تڑپ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور اس نے پوری قوت سے ستارہ کی پیشانی پر خنجر کا وار کیا۔ اور وہ چیخ کر زمین پر گر پڑی۔ اور اس کی خوبصورت پیشانی سے خون

کا ایک زبردست دھارا بہ نکلا۔ اور اب ستارہ کی جگہ وہاں ایک بے حس و حرکت لاش پڑی تھی۔

کچھ دیر نادر پریشان ہو کر اس کے جسم کو دیکھتا رہا۔ اور سوچنے لگا کہ آہ میں نے یہ کیا کر دیا ہے؟ کیا وہ مر گئی ہے۔ خوف اور دہشت نے اس کے وحشیانہ جذبات کو سرد کر دیا۔ اور وہ منہ کے بل بستر پر جا گرا۔ وہ ایک سنگدل اور بہادر سپاہی تھا۔ اور اپنی عمر میں شاید کبھی اسے رونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہ آج بُری طرح رونے لگا۔ کیونکہ آج زندگی میں پہلی مرتبہ اس کا دل ٹوٹ کر چُور چُور ہو گیا تھا۔

(۵)

وفادار آغا باشی ستارہ کی چیخ سن کر خیمے میں داخل ہوا۔ اور چپکے سے ستارہ کو اٹھا لے گیا۔ طبیب کو دکھایا تو وہ کہنے لگا۔ کہ ابھی زندہ ہے۔ آغا باشی کو ستارہ سے بہت عقیدت تھی۔ چونکہ وہ اس جھگڑے کی وجہ سے بے خبر تھا۔ اس لئے اُس نے مناسب یہی سمجھا کہ اس بات کو نادر شاہ سے پوشیدہ رکھے۔

ستارہ کئی دن بے ہوش پڑی رہی۔ نجانے کتنے دن وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی۔ کئی دن بعد جب وہ ہوش میں آئی۔ تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے محبوب سے کوسوں دور ہے۔ آغا باشی نے اسے ایک ارمنی خاندان کے حوالے کر دیا تھا۔ جس نے بڑی خوشی اور کوشش سے اس کی تیمارداری کی۔ اور کہا۔ کہ وہ اس وقت تک ان کے پاس رہ سکتی ہے۔ جب تک کہ بادشاہ پر اس کا زندہ ہونا ظاہر نہ ہو جائے۔ ستارہ بھی اپنے مستقبل پر غور کرنے کے لئے وہیں رہنے لگی۔

ایک مہینہ گزر گیا۔ لیکن ستارہ کو شاہی دربار سے کوئی امید افزا خبر موصول نہ ہوئی۔ اسی طرح دوسرا مہینہ بھی گزر گیا۔ اور تیسرا بھی۔ لیکن حالات ویسے کے ویسے رہے۔ اس نے سوچا کہ بادشاہ کو یہ بتا دوں کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ ان تمام اشخاص کے لئے موت

کا پیغام ہوگا۔ جو اس واقعہ سے متعلق ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نادر نے اپنی موجودہ زندگی میں ستارہ کا نام تک لینے کی ممانعت کر رکھی ہے۔ جب اس کے سامنے اس کا نام لیا جاتا ہے۔ تو وہ دیوانہ سا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے جنون پر قابو نہیں پا سکتا۔ اس کے مصاحبوں کا خیال تھا۔ کہ اس کے جنون کی وجہ غصہ ہے۔ اور یہی خیال ستارہ کا بھی تھا۔ البتہ شیرازی اور صرف شیرازی جانتی تھی۔ کہ نادر شاہ کو غم نے دیوانہ کر رکھا ہے۔ اسے ستارہ سے بے انداز محبت تھی۔ ایسی محبت جو بمشکل کسی مرد کے دل میں کسی عورت کے لئے پیدا ہو سکتی ہے۔ جس دن سے اس نے ستارہ کو قتل کر دیا تھا اسے کسی بات میں لطف نہ آتا تھا۔ وہ نیم دیوانہ ہو گیا تھا۔

وہ قسمت کے ساتھ ایک بے باک جنگ میں مصروف تھا۔ سالہا سال کی کشمکش کے بعد اس نے جو سلطنت حاصل کی تھی۔ اس کی باگیں وہ مضبوطی سے تھامنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن یہ باگیں اس کی گرفت سے نکلی جا رہی تھیں۔ اور اسے پورا پورا یقین تھا۔ کہ اب اس میں انہیں دوبارہ مضبوطی سے تھامنے کی قوت نہیں رہی۔ اس احساس سے اس کا مزاج بے حد چڑچڑا اور غضبناک ہو گیا تھا۔ اور اس کے مصاحبوں کو ہر وقت اس کے عتاب سے اپنی جانوں کا خطرہ رہتا تھا۔

مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ اور اسی طرح کئی سال بھی گزر گئے۔ لیکن ستارہ کو نادر کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہ ہوا۔ وہ بالکل مایوس اور دل شکستہ ہو گئی۔ اور اسے یقین ہو گیا۔ کہ اب نادر اسے پوری طرح فراموش کر چکا ہے۔ اب وہ ایک ایسے شخص کی طرح تھی۔ جس کے دن اداس اور راتیں طویل ہوں۔ اور ان طویل دنوں اور راتوں میں اس کے لئے مسرت کا ایک لمحہ بھی نہ آتا ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں نادر کی طرف سے کوئی غصہ یا رنج نہ تھا۔ حالانکہ نادر نے اسے قتل کر دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔

یکایک یہ خبر مشہور ہو گئی۔ کہ نادر اپنی کوتی جنگی مہم انجام دینے کے لئے اس ارمنی گاؤں کے قریب سے گزرے گا۔ جس میں ستارہ کئی سال سے زندگی کے غمزدہ دن گزار رہی تھی۔ ستارہ کے دل میں نادر سے ملنے کی بے پناہ خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ایسے نادر موقعہ سے ضرور فائدہ اٹھا کر نادر سے ملے گی۔ اس کے ہمدردوں اور بہی خواہوں نے اسے بہت سمجھایا۔ کہ وہ یہ حرکت نہ کرے۔ نہیں تو اس مرتبہ اُسے جان سے مار ڈالا جائے گا۔ لیکن اس نے سنی اَن سنی ایک کر دی۔ اس کا ارادہ پہاڑ کی طرح مضبوط اور اٹل ہو گیا۔ اسے موت کا بالکل خوف نہ تھا۔ اس کا خیال تھا۔ کہ سالوں کی بے لطف زندگی سے نادر کے ہاتھوں قتل ہو کر مرجانا زیادہ مسرت انگیز بات ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی محسوس کر لیا۔ کہ اس وقت نادر کو اس کی بہت ضرورت ہو گی۔ چنانچہ اس نے ایک معتبر قاصد تلاش کر کے اور اسے ایک خط دے کر ایرانی لشکر کی طرف روانہ کر دیا۔ در ساتھ ہی وہ ہیرا بھی روانہ کر دیا۔ جو نادر نے اُسے تحفہ کے طور پر دیا تھا۔

ستارہ کی نسوانی فطرت کا قیافہ صحیح نکلا۔ نادر نے ابھی تک اسے نہیں بھلایا تھا۔ اسے درحقیقت اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ یہ معلوم کر کے کہ اس کی ستارہ ابھی تک زندہ ہے۔ اُسے ایک ایسی بے پایاں مسرت حاصل ہوتی جس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا اس نے فوراً شاہی سوار اس گاؤں کی طرف روانہ کئے۔ اور التجا کی کہ جتنی جلدی ہو سکے ستارہ اس کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن اس التجا کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ ستارہ خود ہی اس کی طرف اتنی جلد کھچ آتی۔ جس طرح مقناطیس کی طرف لوہا جاتا ہے۔ ابھی دو دن بھی نہ گزرے تھے کہ وہ پھر ایک ملکہ کی سی شان و شوکت کے ساتھ ایرانی لشکر میں جا پہنچی۔

نادر بہت بے قراری کے ساتھ اس سے ملا۔ ان پُرمسرت لمحات میں اسے ماضی کی تمام مصیبتیں ایک خواب کی طرح بھول گئیں۔ اب ان دونوں کی جدائی ناممکن تھی۔

اب دنیا کی کوئی طاقت انہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی تھی۔ محبت کی ٹوٹی ہوئی زنجیر کی کڑیاں پھر سے جڑ کر مضبوط ہو گئیں، بلکہ پہلے سے بھی زیادہ مضبوط ہو گئیں۔

لیکن اب نادر کی شہرت اور شوکت وعظمت کے دن گزر چکے تھے۔ وہ مسرت بھرے دن اب رخصت ہو چکے تھے۔ قسمت اب اس کے خلاف ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی کے لئے انتہائی جد وجہد میں مصروف تھا۔ اس کے جانثار ساتھی ہی اب اس کے دشمن بن چکے تھے۔ ظاہر تھا کہ اس کا انجام اب قریب ہے۔

ایک رات جب کہ دنیا میں چاروں طرف خموشی اور تاریکی کی حکومت تھی۔ اور ستارہ اپنے غمزدہ آقا کے بستر کے قریب بیٹھی اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ اسے باہر سے کسی کی آمد کا احساس ہوا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھی۔ لیکن اب کی مرتبہ خطرے کی خبر اسے دیر سے ملی۔ اس سے پہلے کہ وہ چیخ کر یا کسی اور طریقہ سے نادر کو جگا سکے۔ قاتل خیمے میں آ داخل ہوئے۔ وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح سلطان پر ٹوٹ پڑے۔ اور تھوڑی دیر میں انہوں نے خوابیدہ سلطان کو قتل کر دیا۔

اس کے بعد جب غرض ناشناس محافظ خیمے میں داخل ہوئے۔ تو انہوں نے وہاں ایک عجیب درد انگیز نظارہ دیکھا۔ ان کا عالی مرتبت اور پر شوکت شہنشاہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے دیو زاد مضبوط جسم سے اس حسین عورت کا نازک جسم لپٹا تھا۔ جس سے اسے بے اندازہ محبت تھی۔ اور ایک تیز آبدار خنجر اس کے دل میں پیوست ہو چکا تھا۔

سیفو کی داستانِ عشق

(۱)

یونان کی آتش نوا شاعرہ سیفو سے کون واقف نہیں۔ اس کی آتشیں نظمیں اب بھی مردہ دلوں میں عشقیہ جذبات کی بجلی دوڑا دیتی ہیں۔ اور دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کی گردنیں اب بھی اس کا نام سن کر فرطِ احترام سے خم ہو جاتی ہیں۔

سیفو کے کلام کا بیشتر حصہ زمانے کی دستبرد کی نذر ہو گیا ہے۔ اس کے کلام کا موجودہ مجموعہ صرف ان نظموں پر مشتمل ہے۔ جو مختلف مصنفین نے حوالے کے طور پر اپنی کتابوں میں نقل کیں۔ ورنہ زمانہ شاید اس شعلہ نوا شاعرہ کے آتشیں کلام سے بالکل محروم رہتا۔ شاعروں کی زندگیاں اکثر رنگین ہوتی ہیں۔ لیکن سیفو نے جیسی رنگین اور رومانی زندگی بسر کی۔ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملتی ہے۔ سیفو کے حالاتِ زندگی پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کے صحیح حالات سے کوئی بھی واقف نہیں۔ اس کے جو حالات ملتے ہیں۔ وہ محض قیاسات پر مبنی ہیں۔ تاہم سیفو کی ہستی ہی ایسی ہے۔ کہ ہر مصور نے اس کی الگ تصویر بنا کر اسے اپنے مذاق کے مطابق پیش کیا ہے۔ اور ہر مصنف اور ہر افسانہ نگار نے اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی خود بخود کوشش کی ہے۔ ہم ناظرین کو یونان کی اس حسین ترین شاعرہ کی رومانی زندگی کے صرف دو پہلو دکھائیں گے۔

سیفو اپنے زمانے کی خوبصورت ترین عورت تھی۔ تمام یونان میں اس کے حسن کی نظیر نہیں ملتی تھی۔ نہ صرف حسن میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ علم و فضل اور شاعری میں

بھی یونان کی کوئی عورت تو کجا کوئی مرد تک اس کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ ایک متمول خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اور اس کا قصرِ مرمریں شاید بادشاہِ وقت کے محلات سے بھی زیادہ پُرشکوہ تھا۔ اس کے گھر کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا۔ وہ اکثر گھر کی بجائے اپنے باغ میں رہتی اور یونان بھر کے شاعر، مصنف اور ادیب وہیں آ کر اس کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے ہر وقت اس کے گرد اس کے مداح شاعروں اور ادیبوں کا جمگھٹا رہتا۔ اور وہ باغ میں ان کے درمیان اس طرح نظر آتی۔ جیسے بلبلوں کے درمیان کوئی خوبصورت پھول۔

سیفو ایک بیباک شوخ اور عشقیہ مزاج شاعرہ تھی۔ جھلمل جھلمل کرتا ہوا قیمتی اور چست لباس پہنتی تھی۔ تاکہ اس کے خوبصورت جسم کی اچھی طرح نمائش ہو سکے۔ اس کے گورے گورے بدن پر رنگین لباس ایسا پھبتا تھا۔ کہ وہ یونان کی حسن کی دیوی معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنے خوبصورت بازو اور سینے کو نیم عریاں رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ ایک قدیم یونانی قصبے نلاڈل کے ایک بیباک شاعر نے جس کا نام سائبرٹ تھا۔ بے اختیار سیفو کی لمبی لمبی زلفوں کو جو اس کے شانوں پر بکھری تھیں۔ بھری مجلس میں چوم لیا۔ اگر کوئی اور عورت ہوتی۔ تو مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتی۔ لیکن سیفو اس کی اس حرکت کے جواب میں صرف مسکرا اٹھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ سیفو ہر کہ ومہ کا پہلو گرم کرتی تھی۔ معمولی آدمی تو اس کے عظیم الشان قصر میں آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ اور جو بڑے بڑے لوگ اس کی محفل میں موجود ہوتے تھے۔ وہ بڑی تمیز اور سلیقے سے وہاں بیٹھتے۔ خود اس کا رعب حسن اسکی پاکیزگی کا سب سے بڑا محافظ تھا۔ وہ شوخ تھی۔ طرار تھی چنچل تھی اور بلبل ہزار داستان کی طرح اپنے مداحوں کے حلقے میں بیٹھ کر شوخیاں کرتی رہتی۔

سیفو ایک سنگدل حسینہ تھی۔ اس کے دام عشق میں ایک نہیں ہزاروں نوجوان اسیر تھے۔ ملک کے بڑے بڑے امرا اس کی دہلیز پر سجدہ ریز ہوتے تھے۔ لیکن سیفو کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی۔ کئی نوجوانوں نے اس سے محبت کی۔ اور ناکامی کا منہ دیکھنے

کے بعد خودکشی کر کے اجل سے ہمکنار ہو گئے۔ چونکہ اس نے کئی نوجوانوں کا دل توڑا تھا اس لئے ایک مرتبہ قدرت نے اس سے خوفناک انتقام لیا۔

زدرد نامی یونان کا ایک مشہور و معروف عیاش تاجر جو اس وقت یونان کا سنگدل ترین آدمی سمجھا جاتا تھا۔ اس پر عاشق ہو گیا۔ چونکہ ہر شام سیفو کے گھر میں شہر کے امرا اور عالموں فاضلوں کی محفل ہوتی تھی۔ اس لئے کسی ذی اقتدار آدمی کے لئے سیفو سے تعارف کرنا کوئی اتنی مشکل بات نہ تھی۔ زدرد بھی تھوڑی مدت میں اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یعنی یونان کی سب سے زیادہ حسین، چنچل اور شوخ عورت کی محفل سے لطف اندوز ہونے کا اسے بھی موقعہ مل گیا۔ سیفو بڑی حاضر جواب، اور شوخ ادا تھی اور ہنسی مذاق اس کی گھٹی میں پڑا تھا۔ ایک دن وہ اپنے شیدائیوں کے حلقے میں جگمگ جگمگ کرتا ہوا زرق برق لباس پہنے بیٹھی تھی۔ زدرد ایک مخملیں صوفے پر بیٹھا شراب کا ایک جام خالی کر رہا تھا۔ سیفو بھی اس وقت پئے ہوئے تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسے نہ جانے کیا خیال آیا۔ کہ وہ زدرد کی لمبی لمبی مونچھوں کا مذاق اڑانے لگی۔ اور کہنے لگی۔ کہ زدرد اس وقت تمہاری مونچھیں ریچھ کی دم معلوم ہو رہی ہیں۔

زدرد ایک پہلے درجے کا بد دماغ شخص تھا۔ اس نے کبھی کسی سے اپنے متعلق ایسے فقرے نہیں سنے تھے۔ جب سیفو کی مجلس کے حاضرین نے زدرد کی گت بنتے دیکھی۔ تو انہوں نے زور زور سے قہقہے لگانے شروع کر دیئے۔ اس پر زدرد کے غصہ کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ اور وہ غصے سے بھرا ہوا اس رنگین محفل سے اٹھ کر چلا گیا۔ اور دل میں ٹھان لی۔ کہ چاہے اسے جان ہی کیوں نہ گنوانا پڑے۔ وہ سیفو سے اپنی ہتک کا خوفناک انتقام لے گا۔

سیفو کو شکار کا بڑا شوق تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے

کے لئے جنگل میں نکل جاتی کئی کئی دن پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں میں ایک خوبصورت ہرنی کی طرح اپنے شکاریوں کی فوج کے ساتھ کلیلیں کرتی نظر آتی۔ چونکہ وہ ایک بلند پایہ شاعرہ تھی۔ اس لئے خوبصورت مناظر سے اسے قدرتاً دلچسپی ہی نہ تھی۔ بلکہ وہ خوبصورت مناظر کی عاشق تھی۔ اپنی زندگی کے اکثر ایام اس نے گلپوش وادیوں اور لہلہاتے مرغزاروں میں گزارے تھے۔

ایک دن وہ شکاریوں کی پارٹی کے ہمراہ جنگلوں میں آبادی سے بہت دور نکل گئی۔ چونکہ شوخ اور الہڑ تھی۔ سیر کے جنون میں اپنے ہمراہیوں سے بچھڑ گئی۔ گھوڑے پر سوار تھی۔ اور شام کا وقت تھا۔ تھوڑی دیر میں کہیں سے کہیں نکل گئی۔ اور اس پر غضب یہ ہوا کہ خوفناک طوفانِ باد نے اسے آلیا۔ ہر چند اس نے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد اسے دور سے روشنی سی نظر آئی۔ اور اس نے اس سمت اپنا گھوڑا دوڑا دیا۔ جب وہ روشنی کے قریب پہنچی۔ تو بوندا باندی بھی ہونے لگی۔ بیچاری مجبور تھی۔ کہ وہیں پناہ لے۔ طوفانِ باد باراں قیامت بن کے چھا رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ اور راستہ ملنے کی کوئی صورت ہی نظر نہ آتی تھی۔ وہ ایک بہادر عورت تھی۔ اس کے علاوہ یونان بھر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا کہ جو ملک کی اتنی زبردست شاعرہ، نہ صرف زبردست شاعرہ، بلکہ ملکہ حسن اور یونان کی متمول ترین دوشیزہ کو بخوشی اپنے گھر میں پناہ نہ دے۔ پناہ تو ایک طرف اپنے سر آنکھوں پر جگہ نہ دے۔ اس نے فوراً ہی ایک چھوٹے سے مکان کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ جو اس وسیع و عریض جنگل میں ایک تنہا اور ویران جگہ پر واقع تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے ہی ایک شخص نمودار ہوا۔ اور اپنے دروازے پر ایسے عجیب و غریب وقت میں ایک حسین و جمیل عورت کو جو قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی۔ دیکھکر حیران رہ گیا۔ جب سیفو نے اس سے کہا۔ کہ میں یہاں رات بسر کرنا چاہتی ہوں۔ تو وہ فوراً اپنے مالک کو اطلاع دینے کے لئے

اندر بھاگ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سیفو کو اندر لے گیا۔ اور اس کا گھوڑا اس نے ایک چھوٹے سے کمرے میں باندھ دیا۔

یہ چھوٹا سا مکان دراصل زدرو کی شکارگاہ میں واقع تھا۔ اور زدرو ہی اس کا مالک تھا۔ مکان میں چکا چوند پیدا کرنے والی ایک مشعل جل رہی تھی۔ ملکہ حسن سیفو نے اس مکان میں قدم رکھا تو فضا کی تجلیوں میں پہلے سے سہ چند اضافہ ہوگیا۔ جب سیفو جھینپتی شرماتی، جھجکتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تو وہاں زدرو کو دیکھ کر فرطِ حیرت سے بت بن گئی۔ سیفو نے اس کے ساتھ بڑے تپاک سے ملنا چاہا۔ لیکن زدرو جیسے بدمعاش کی آنکھوں میں عیاری کی چمک دیکھ کر کچھ ٹھٹک سی گئی۔ اگر اس وقت مکان سے باہر طوفانِ باد باراں نے قیامت برپا نہ کی ہوتی۔ تو سیفو جیسی مغرور اور ذکی الحس عورت اس مکان پر لعنت بھیج کر فوراً باہر چلی جاتی۔ وہ تو بادشاہِ وقت کو بھی خاطر میں نہ لانے والی عورت تھی۔ بہرحال زدرو نے جو خود ایک امیر آدمی تھا۔ فوراً سیفو کو اس کے شایانِ شان کھانا اور قیمتی لبسترمہیا کر دیا۔

تھوڑی دیر بعد زدرو سیفو سے فحش مذاق کرنے لگا چونکہ وہ خود بھی ایک آزاد عورت تھی۔ اس لئے پہلے پہل تو اس نے زدرو کی باتوں کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن تھوڑی ہی دیر بعد سیفو کو معلوم ہوگیا۔ کہ شاید اس کے اوباش میزبان کی نیت اسکے باغِ حسن سے گلچینی کرنے کی ہے۔ زدرو ایک ایسا اوباش شخص تھا جسکے ہاتھوں یونان کی اکثر حسین عورتوں کی عصمت خطرے میں رہتی تھی۔ یونان کے حلقہ "اربابِ نشاط" کی کوئی حسینہ ایسی نہ تھی۔ جس نے اسے شربتِ وصال نہ پلایا ہو۔ یا جس سے اس نے زبردستی شربتِ وصال نہ پیا ہو۔ اور اپنے علاقے کے غریبوں کی کوئی بہو بیٹی ایسی نہ تھی۔ جس کو ایک رات اپنی شمع شبستان نہ بنایا ہو۔ ایسے شخص کے گھر اگر رات کے وقت اور پھر اس تنہا اور ویران جگہ کوئی عورت آجاتی۔ تو اس کی عصمت کس طرح محفوظ رہ

سکتی تھی۔

سیفو ایک بارعب عورت تھی۔ کسی مرد کو اس کی طرف آنکھ اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن زدرو اپنے دل میں فیصلہ کر چکا تھا۔ کہ وہ سیفو سے اپنی توہین کا بدلہ ضرور لے گا۔ وہ ایک کینہ پرور شخص تھا۔ اگر سیفو بھری محفل میں اس کا مذاق نہ اڑاتی تو آج وہ اس سے اس قدر بے رحمی سے پیش نہ آتا۔ لیکن اپنی بات پر اڑ جانا۔ اور اپنی ہٹ پوری کرنے کے لئے اپنی جان پر کھیلنے کے لئے تیار ہو جانا اس کی فطرت تھی۔ نصف شب تک تو وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد زدرو سیفو کے قریب آ بیٹھا۔ سیفو اگرچہ ایک آزاد خیال، شوخ اور بیباک عورت تھی۔ لیکن ابھی تک اس کا جسم پاک اور مقدس تھا۔ اس کے جسم سے مرد کا جسم نہیں چھوا تھا۔ وہ باغ جنت کی حسین ترین کلی کی طرح پاک تھی۔

زدرو کی حرکتوں سے اسے معلوم ہو گیا۔ کہ اس کی نیت خراب ہو رہی ہے۔ تاہم اس نے اپنے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا نہ ہونے دیئے۔ لیکن جب یکایک زدرو نے اٹھ کر اس کا منہ چوم لیا۔ تو اس کی خوبصورت پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور وہ زدرو سے کہنے لگی "دیکھو زدرو آج تک کسی مرد کو یہ جرأت نہیں ہوئی۔ تم نے پہلی مرتبہ میرے پھولوں سے مقدس ہونٹوں کو آلودہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ میں نے اس وقت تمہیں آ کر تکلیف دی ہے اور تمہارے گھر سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اسلئے میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن اب دائرہ تہذیب سے آگے قدم نہ نکلنا۔

زدرو نے اس کی بات سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگا "تم نے بھری محفل میں میری توہین کی۔ جب تک اس توہین کا ازالہ نہ ہو جائے مجھے چین نہیں آسکتا۔ میں نے جس بات کی قسم کھائی تھی۔ وہ پوری ہو کر رہے گی"

سیفو کڑک کر بولی "تمہارا اس بات سے کیا مطلب ہے؟"

اس فقرے کے جواب میں اوباش زدرو ملکہ حسن سیفو پر اس طرح ٹوٹ پڑا جس طرح دیوانہ بھونرا کلی کی طرف جھپٹتا ہے۔ وہ بجلی کی طرح اچھل کر اپنے بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور سیفو کو اپنی آہنی آغوش میں اٹھا کر اپنے مخملیں بستر پر لا ڈالا۔ سیفو نے اپنے آپ کو اس وحشی کے پنجے سے چھڑانے کی بہتری کوشش کی۔ لیکن سنہری چڑیا جال میں پھنس چکی تھی۔ آخر عورت ذات تھی۔ اوباش زدرو کی دست درازیوں کا مقابلہ نہ کر سکی اور زدرو نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ بھینچ کر پیار کرنا شروع کیا۔ وہی عورت جس نے ایک مرتبہ یونان کے ولی عہد کے حرم میں جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت ایک اوباش مرد کی آغوش میں ایک ایسی سنہری چڑیا کی طرح تلملا رہی تھی۔ جو صیاد کی مٹھی میں ہو۔

کم بخت زدرو نے جوش وحشت و دیوانگی میں یونان کی اس حسین ترین دوشیزہ کے اتنے بوسے لے ڈالے کہ وہ نڈھال ہو کر بستر پر گر گئی۔ مدافعت کی قوت اسے جواب دے چکی تھی۔ اور اسے معلوم تھا کہ آج وہ لڑکی سے عورت بن جانے والی ہے۔ وہ بستر پر گری ہی تھی۔ کہ زدرو نے اس کے باغ حسن سے نہایت بیرحمی کے ساتھ گلچینی شروع کر دی۔ اس کا سیمیں و زریں ریشمی لباس "تار تار" ہو گیا۔ اور اس کا دلکش مرمریں سینہ جسے چشم آفتاب تک نے نہ دیکھا تھا۔ آج ایک اوباش کی ہوس رانیوں کا مرکز بن گیا ——— وحشی زدرو نے تمام رات اس نازک اور شوخ کلی سے اس قدر محبت کی کہ صبح جب وہ اٹھی۔ تو اس کے خوبصورت لمبے لمبے بال عریاں شانوں پر پریشان ہو رہے تھے۔ شگفتہ گال زرد پڑ گئے تھے۔ اور اس کا بند بند شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا ———

صبح اس نے دیکھا کہ اس کا زرتار لباس اب پہننے کے قابل نہیں رہا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اور زدرو سے کہنے لگی۔ "میری پاکیزگی لوٹنے والے! مجھے تباہ کرنے

والے! مجھے میرے گھر سے نیا لباس منگوا دے۔ تاکہ میں اپنا گناہ آلودہ پھٹا ہوا لباس
اتار پھینکوں اور ندی میں جسم کو غسل دے کر پاک بنانے کی کوشش کروں۔ اگرچہ
اب یہ جسم جسے شمیم کے جھونکے سے بھی میں نے بچا رکھا تھا۔ تم نے ہمیشہ کے لئے
آلودہ کر دیا ہے"

صیفو تمام رات زدرو کے بستر پر نیم عریاں رہی تھی۔ اس کے شرم وحیا کے پردے
ایک اوباش چاک کر چکا تھا۔ چنانچہ صبح اس نے کوئی شرم محسوس نہ کی۔ اور جب تک
اس کے پہننے کے لئے نیا لباس نہ آگیا۔ وہ اپنے کمرے میں بے لباس رہی۔ اس کا پہلا
لباس رات کی حیوانی کشمکش میں تار تار ہو گیا تھا۔ اور پہننے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس کا
پہننا نہ پہننا برابر تھا۔ حیوان صفت زدرو نے صبح پھر سیفو سے شربتِ وصل پینے
کا اصرار کیا تشکستہ دل سیفو باچشمِ پرنم اس کے بستر پر جا گری اور کہنے لگی "اے حیوان!
میرا جسم گناہ آلودہ تو ہو ہی گیا۔ اب تیرا جی چاہے تو ایک مرتبہ نہیں۔ بلکہ پچاس مرتبہ مجھے اپنی
ہوس رانیوں کی آماجگاہ بنا سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھ کہ میرا انتقام بہت خوفناک ہوگا"
یونان کی ملکہ حسن لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنی چارپائی پر سے اٹھی۔ نیا لباس
پہنا اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گھر چل دی۔ وہ دوشیزہ بن کر آئی تھی۔ اور
عورت بن کر چلی گئی۔

(۳)

اس حادثہ کے دو ماہ بعد سیفو نے محسوس کیا کہ گناہ کی رات جو وہ جنگل میں بسر
کر چکی ہے۔ اپنی ایک مستقل نشانی اُسے دے گئی ہے۔ اور عنقریب وہ ایک بچے کی
ماں بننے والی ہے۔ اس سے پہلے ہی اپنی دوشیزگی زائل ہونے کا صدمہ تھا۔ اس رونگٹے
کھڑے کر دینے والے انکشاف نے اسے اور بھی زیادہ پریشان کر دیا۔
ایک دن وہ یکا یک اپنے شہر سے غائب ہوگئی۔ اور شہر میں مشہور کر دیا گیا۔ کہ

سیفو کی صحت خراب ہو گئی ہے۔ اور طبیبوں نے اسے کوہ لوبیا میں چند ماہ گزارنے کا مشورہ دیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔"

سیفو نے بچے کو ایک عورت کے سپرد کیا۔ اس کی پرورش کے لئے اس عورت کو بہت سی دولت دے دی۔ اور خود واپس چلی آئی۔

جب یہ بچہ پانچ سال کا ہو گیا۔ تو سیفو نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔ اور لوگوں میں مشہور ہو گیا۔ کہ سیفو نے اپنا دل بہلانے کے لئے کسی غریب عورت سے اس کا بچہ لے لیا ہے۔ لوگ بہت حیران ہوتے کہ سیفو کو اس بچے سے کیوں اتنی محبت ہے لیکن اصل راز صرف سیفو کی دو سہیلیوں کو ہی معلوم تھا۔ اگرچہ یہ بچہ ایک گناہ کی یادگار تھا۔ تاہم سیفو جب تک اسے دیکھ نہ لیتی اسے قرار نہ آتا۔

سیفو نے زدرو سے ایک خوفناک انتقام لیا۔ اس نے اپنے چند دوستوں کو حکم دیا۔ کہ وہ زدرو کی لڑکی کو زبردستی اٹھا لائیں۔ دوسرے دن زدرو کی کنواری لڑکی سیفو کے گھر پہنچ گئی۔ اور سیفو نے اسے اس وقت تک اس کے گھر واپس نہ بھیجا جب تک لڑکی کو اپنے تین غلاموں کی ہوس رانیوں کا شکار نہ بنا دیا۔

۶

ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ سیفو یونان کی سب سے زیادہ حسین عورت تھی، اور اس کا زرق برق لباس، سیمگوں بدن نورِ خورشید و ماہ کو شرماتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصّہ بناؤ سنگار پر صرف کرتی تھی۔ اور جب جھلمل جھلمل کرتا ہوا لباس پہنے بن سنور کر باہر نکلتی تو نوجوانوں کے سینوں پر آرزوؤں اور اُمنگوں کے سانپ لوٹ جاتے اس کے جسم کے عریاں حصّوں کو دیکھ کر یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے تجلّی اور نور کے دریا میں نہا کر آئی ہو۔

ان دنوں یونان کے مرد، امرد پرستی کی طرف زیادہ راغب تھے اور عورتیں

عورتوں کے عشق میں مبتلا تھیں۔ سیفو بھی اپنے دل کی پیاس مردوں کی بجائے عورتوں سے محبت کر کے بجھاتی۔ اس کے پاس ایک دو نہیں۔ سینکڑوں محبوبائیں تھیں۔ جو رنگ رنگ کا لباس پہن کر اس کے گرد منڈلاتی رہتیں۔

سیفو اس قدر نازک مزاج اور عیش پسند تھی۔ کہ اس کے چاندی کے پلنگ پر ہر وقت پھولوں کی سیج بچھی رہتی۔ پھولوں کی اس سیج پر وہ لباس کی قید سے آزاد ہو کر لیٹتی تاکہ اس کے گداز مخملیں جسم میں پھولوں کی خوشبو بس جائے۔ اور حقیقت ہے کہ پھولوں کے بستر پر سونے سے اس کے جسم میں مستقل طور پر گلاب اور یاسمین کے پھولوں کی خوشبو رچ گئی تھی یعنی وہ خود ایک خوشبو دار پھول بن گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی حسین عورت کے ملک میں کس قدر بےشمار عاشق ہو سکتے ہیں۔ سیفو کے سینکڑوں عاشق تھے۔ لیکن ان میں سے ایک عاشق ایسا بھی تھا۔ جسے سیفو سے صحیح معنوں میں عشق تھا۔ اس کا نام زرکوئینٹ تھا اور وہ ایک والئے ریاست کا بیٹا تھا۔ شہزادہ زرکوئینٹ سیفو کو ایک دیوی سمجھ کر اس کی پرستش کرتا تھا۔ اس کے قدموں کی خاک اپنی آنکھوں سے لگاتا تھا۔ ہر وقت پروانہ بن کر اس کا طواف کرتا رہتا۔ جب سیفو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں کواڑ کھول کر جاتی تو شہزادہ زرکوئینٹ کواڑ کے اس حصے کو بار بار چومتا۔ جسے سیفو کا ہاتھ لگا ہوتا۔ لیکن سیفو کا یہ عاشق عمر میں اس سے نو سال چھوٹا تھا۔ اور وہ اسے ایک بچہ سمجھتی تھی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ کہ یہ نوعمر لڑکا اپنے سے نو سال بڑی حسینہ کے دامِ محبت میں گرفتار ہے سیفو اسے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح چاہتی ہے۔ اور سیفو پر اپنے نوعمر عاشق کی محبت کا راز اس وقت آشکارا ہوا۔ جب اس نے ایک دن ایک دروازے کے پردے کی اوٹ میں سے زرکوئینٹ کو ایک نہایت دلچسپ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ زرکوئینٹ کی آنکھیں پُرنم ہو رہی تھیں۔ اور وہ سیفو کی ایک مخمل کی زرتار جوتی کو چوم رہا تھا۔

سیفو مسکرا کر پردے کی اوٹ سے باہر آگئی۔ اور کہنے لگی ”زرکوئینٹ یہ کیا کر

رہے ہو؟"

زرکویت کے لئے یہ فقرہ جلتی آگ پر تیل کا کام کر گیا۔ اور وہ سسکیاں بھر بھر کر رونے لگا۔ اور سیفو کے قدموں پر گر پڑا۔ سیفو نے اسے کھینچ کر اپنے قدموں سے اٹھا لیا۔ اور اپنے پہلو میں ایک صوفے پر بٹھا لیا۔ اور اپنے ۱۷ سالہ عاشق کو بڑی شفقت سے پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر تسلی دینے لگی۔ فرط اضطراب سے ننھے عاشق نے اپنے سر کو سیفو کی مہکتیں اور عطر آگیں گود میں گرا دیا۔ اور پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے رونے لگا۔ جب سیفو نے اسے چپ کرا لیا۔ تو مسکرا کر اس سے پوچھنے لگی۔ "زرکوئٹ کیا بات ہے؟ تم کیوں رو رہے تھے؟" ـــــ اگرچہ وہ جانتی تھی کہ زرکوئٹ کو اس کے عشق نے مضطرب کر دیا ہے تاہم اپنی دل لگی اور ہنسی کی عادت سے مجبور ہو کر وہ اسے چھیڑنے لگی۔ اور بالآخر اس نے اس کے منہ سے وہ الفاظ کہلوا ہی لئے۔ جو آج تک اس نوخیز نوجوان نے نہ کہے تھے۔

زرکوئٹ اس سے کہنے لگا "میں جانتا ہوں کہ تمہارے مقابلے میں میری ہستی کچھ بھی نہیں ـــــ تم ملکۂ حسن ہو اور میں ایک ادنیٰ بھکاری ہوں۔ پھر بھی مجھے تم سے محبت ہے۔ اور جس طرح ذرہ آفتاب کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اسی طرح میں ایک پروانے کی طرح تمہاری شمع رُخ کا پجاری رہوں گا۔ آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی محبت کا ہدیہ تمہیں پیش کروں۔ اگر تم اسے قبول کرو تو خیر، ورنہ میں خودکشی کر لوں گا۔ آج میں تم سے شادی کی درخواست کرتا ہوں۔ تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے منسوب ہو جاؤ اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو پھر میرے پاس خودکشی کے سوائے کوئی چارہ کار نہیں۔"

سیفو نے اپنے نوخیز عاشق کی درد بھری التماس سن کر کہا۔ "زرکوئٹ! تم مجھے بہت عزیز ہو۔ لیکن تمہیں اپنے بچوں کی طرح سمجھتی ہوں۔ اور اگر میرے دل میں تمہاری محبت موجود بھی ہو۔ تو بھلا تمہیں بتاؤ۔ کہ میں تم سے شادی کس طرح کر سکتی ہوں۔"

میں خود لوگوں کا مذاق اڑانے کی عادی ہوں۔ جب بڑے بڑے شعراء اور ادیب دیکھینگے کہ میں نے ایک چھوٹے سے لڑکے سے شادی کرلی ہے۔ تو میرا کس قدر مذاق اڑائینگے خدا کے لئے مجھے رسوا نہ کرو۔ میں مدت سے دیکھ رہی ہوں۔ کہ میرے عشق میں تمہارا برا حال ہو رہا ہے۔ تمہارے رخسار زرد ہو گئے ہیں۔ اور تم ہر وقت مغموم رہتے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میرے دل میں تمہارے لئے کس قدر محبت موجود ہے۔ لیکن اس دنیا میں ہم ہر وہ بات نہیں کر سکتے۔ جس کے لئے ہمارا جی چاہتا ہو۔ بہتر ہو کہ تم کسی حسین عورت سے شادی کرلو۔ تاکہ تمہارا دل بہل جائے۔ میں خود گلشن یونان کی کسی حسین ترین "تتلی" سے تمہاری شادی کردوں گی پھر تم مجھے بھول جاؤ گے۔ میں کئی دنوں سے تمہاری دیوانوں کی سی حرکت کا مشاہدہ کر رہی ہوں۔ کل تم میرے کپڑوں کو آنکھوں سے لگا رہے تھے اور چوم رہے تھے۔ آج تم میری زرتار جوتی کو بوسے دے رہے تھے۔ ہر وقت تم میرے دیئے ہوئے رومال کو آنکھوں سے لگائے رکھتے ہو۔ یہ تمام باتیں عقل و فہم سے بعید ہیں۔ بہتر ہے کہ تم مجھ کو بھول جاؤ۔ مجھ میں کوئی خوبی نہیں۔ بھول جاؤ۔ تم مجھے اب تک ایک دوشیزہ سمجھتے رہے ہو۔ لیکن نہیں تم ایک خوفناک راز سے ناواقف ہو۔ میں نے اس راز سے اب تک کسی کو آگاہ نہیں کیا۔ لیکن تم چونکہ میرے سچے چاہنے والے ہو۔ اس لئے میں تم سے کوئی بات چھپانا نہیں چاہتی۔ تم یہ معلوم کرکے حیرت زدہ رہ جاؤ گے کہ میں ایک بچے کی ماں ہوں۔ اگرچہ میں نے اب تک شادی نہیں کی لیکن یہ بچہ ایک خوفناک رات کی یادگار ہے۔ اس رات میرا جسم ایک اوباش مرد کی ہوس کا مرکز بنا اور میں ایک عیاش مرد کے بستر پر اس طرح مسلی گئی۔ جیسے موسم بہار کی کوئی نازک کلی۔ جس بچہ سے تم ہر روز آکر باتیں کرتے ہو۔ وہی میرے پہلے گناہ کی یادگار ہے۔ اگرچہ اس گناہ کا آغاز میری جانب سے نہیں ہوا۔ بلکہ ایک مرد کے آہنی ہاتھوں اور بے رحمانہ قوت نے مجھے اپنے بستر پر گرا لیا۔ اور زبردستی میرا پردہ عصمت چاک کر ڈالا۔ تم ایک شہزادے

ہو۔تم ایک گنہگار عورت سے کیوں شادی کرتے ہو؟ تم مجھے ایک پاکباز کہا کرتے ہو۔ لیکن میرے خزانۂ حسن سے عصمت کا لعل ایک رات ایک اوباش ڈاکو لے جا چکا ہے کیا تم ایک بے عصمت عورت کو چاہے وہ کس قدر حسین ہی کیوں نہ ہو ——— اپنی آغوشِ محبت میں لینا پسند کرو گے؟"

زرکوبیت نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور اٹھ کر وہاں سے چل دیا۔

——— (۵) ———

سیفو کے محل کی خوابگاہ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ آج اس کے شبستان میں لاتعداد کافوری شمعیں روشن تھیں۔ اور رات پر روزِ روشن کا گمان ہوتا تھا۔ گلاب کے عرق کے فوارے کے نیچے نہانے کے بعد آج سیفو سولہ سنگار کر رہی تھی۔ اس نے اپنا جھلمل جھلمل کرتا ہوا بہترین لباس پہن رکھا تھا۔ لباس چست اور باریک تھا۔ اور سیفو کے سینے کا دلکش ابھار اور اس کے دوسرے سڈول اعضا پکار پکار کر اپنے حسین ہونے کا اعلان کر رہے تھے۔ وہ لمبے لمبے سیاہ بالوں کو جو سیاہ ناگن کی طرح بل کھاتے ہوئے تھے۔ بہترین خوشبودار تیل لگا کر انہیں ہاتھی دانت کی کنگھی کر رہی تھی۔ اس نے اپنی ستاروں کی سی چمکیلی آنکھوں میں کاجل لگا رکھا تھا۔ اور شہد میں خونِ کبوتر ملا کر اپنے خوبصورت ہونٹوں کو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت اور شیریں بنا لیا تھا۔ اس وقت وہ کوئی ارضی مخلوق نہیں، بلکہ باغِ جنت کی حور یا پرستان کی ملکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے لباس سے عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ اور اس وقت وہ ایک مہکتا ہوا پھول معلوم ہو رہی تھی۔ وہ زمانۂ دوشیزگی میں بھی کبھی اتنی خوبصورت نظر نہ آئی تھی۔ جتنی خوبصورت وہ آج دکھائی دیتی تھی۔ دیکھنے والے کو معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہ کوئی پری ہے۔ اور ابھی اڑ کر آنکھوں سے اوجھل ہو جائیگی۔

تھوڑی دیر بعد سیفو کی ایک خادمہ اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور کہنے لگی۔

"شہزادہ زرکوئیت نے آنے سے انکار کر دیا ہے۔"

زرکوئیت کو سیفو کے عشق نے اب بالکل نڈھال کر دیا تھا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ سیفو چونکہ مجبوراً اس کے ہدیہ محبت کو ٹھکرا چکی تھی۔ اسلئے زرکوئیت نے اس کے گھر آنا چھوڑ دیا تھا۔ سیفو اچھی طرح جانتی تھی کہ اگر اس نے زرکوئیت سے التفات نہیں کیا تو وہ تھوڑے ہی عرصہ میں شمع کی طرح اسکے فراق میں گھل گھل کر ختم ہو جائیگا۔ سیفو ایک سنگدل عورت تھی لیکن زرکوئیت کی تکلیف اس سے نہ دیکھی جاتی تھی۔ وہ اس سے شادی نہ کرسکتی تھی کیونکہ ان دونوں کی عمروں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ لیکن زرکوئیت کا عشق اس کی رگ رگ میں بس چکا تھا۔ معلوم نہیں۔ وہ زرکوئیت پر اتنی مہربان کیوں تھی۔

سیفو مدت سے اپنے اور زرکوئیت کے عشق کے مسئلے پر غور کر رہی تھی۔ اور چاہتی تھی۔ کہ زرکوئیت سے شادی بھی نہ کرے۔ اور عشق کی آگ کے خوفناک شعلوں سے بھی اسے بچالے۔ اسے بیمار دیکھ کر وہ مضطرب ہوگئی۔ اس کا خیال تھا۔ کہ زرکوئیت نوجوان ہے۔ اسے آج تک عورت کا قرب میسر نہیں ہوا۔ اگر وہ میرے ساتھ محبت کی چند راتیں بسر کر لے گا۔ تو اس کے عشق کی آگ کے شعلے سرد پڑ جائیں گے۔ چنانچہ آج اس نے زرکوئیت کو بلا بھیجا تھا۔ تاکہ وہ اس کے ساتھ وصل کی ایک رات بسر کر کے اس کیلئے اطمینان قلب اور سکون مہیا کرے۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس کے علاوہ خود اسکا دل بھی زرکوئیت کی طرف راغب ہو چکا تھا۔

آخر سیفو نے زرکوئیت کو دوبارہ پیغام بھیجا۔ کہ اگر تم نہ آئے تو میں عمر بھر تم سے نہ ملوں گی ——" یہ دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔ اور زرکوئیت فوراً اپنی محبوبہ کے گھر پہنچ گیا۔

نصف شب تک وہ باتیں کرتے رہے۔ جب زرکوئیت اٹھ کر جانے لگا۔ تو سیفو نے اسے روک لیا۔ اور کہنے لگی "آج میں تمہیں جانے نہ دوں گی"

سیفو نے آج پہلی بار اسے پیار بھری شوخ نظروں سے دیکھا۔ اور بازو سے

پکڑ کر اپنے بستر پر لے گئی۔

زرکوئیت پر اپنی محبوبہ کا رعب طاری ہو گیا۔ یوں بھی وہ ایک نوخیز لڑکا تھا۔ تھر تھر کانپنے لگا۔ سیفو نے اسے اپنی عطر میں بسی ہوئی آغوش میں کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اور پھر اپنے شہد سے میٹھے ہونٹ اس کے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے ملا دیئے بس یہی ایک اشارہ کافی تھا۔ زرکوئیت اس کی مخملیں آغوش سے علیحدہ ہو گیا۔ سیفو نشۂ محبت سے مخمور ہو کر اپنے چاندی کے پلنگ پر بچھی ہوئی پھولوں کی سیج پر لیٹ گئی۔ اور زرکوئیت اس پر اس طرح آگرا۔ جس طرح شمع کی طرف پروانہ آتا ہے۔ سیفو کی سانفہائے صندلیں پر سے ریشمی لباس پرے سرکنے لگا۔ اور مرمریں سینے کا کیف آفریں منظر آنکھوں پر نور برسانے لگا۔ دو ہونٹ دو ہونٹوں سے پیوست ہو گئے۔ زرکوئیت کے سینے نے سیفو کے سینے میں اس کے ننھے سے دل کی لطیف دھڑکن محسوس کی۔ اور سیفو کے میٹھے میٹھے خوشبودار سانس کی ہلکی ہلکی آواز اسے سنائی دینے لگی۔ اور نشۂ محبت میں مخمور دو ہستیوں نے اپنے آپ کو حظِ وصال کی مست شیرینی میں کھو دیا۔

(۶)

سیفو اور زرکوئیت جوانی کی راتیں اور مرادوں کے دن بسر کرنے لگے۔ زرکوئیت سیفو کی اس طرح پرستش کرنے لگا۔ جیسے پجاری دلوی کی کرتا ہے۔ شربتِ وصال نے ان کی باہمی محبت کو کم نہ کیا۔ اور وہ دونوں گل و بلبل کی زندگی بسر کرنے لگے۔

لیکن زرکوئیت بڑا وہمی نوجوان تھا۔ ہر روز سیفو سے سینکڑوں شعرا اور علماء ملنے کے لئے آتے تھے۔ زرکوئیت اپنی محبوبہ کی محبت کے نشے میں اس قدر سرشار تھا کہ اسے یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ خورشید و ماہ تک کی نظر اس پر پڑے۔ چنانچہ اس نے سیفو کے ملاقاتیوں کو بھی شک کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ اور سیفو کو ان کی ملاقات سے روکنے لگا۔

سیفو کو فلینی نامی ایک لڑکی سے محبت تھی۔ ایک دن سیفو اپنی محبوبہ کو گود میں لئے پیار کررہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔ کہ مجھے تم سے اتنی محبت ہے جتنی اور کسی سے نہیں۔ بدقسمتی سے زرکوئیت نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھ لیا۔ اور سیفو کی وہ باتیں بھی سن لیں جو وہ اس سے کررہی تھی۔ اس کے دل میں آتش رقابت بھڑک اٹھی اور اس نے جاکر فلینی کو زمین پر پٹخ دیا۔ اور وہ بے چاری زمین پر پڑی سسکیاں بھرنے لگی۔ سیفو کو اپنے عاشق کی یہ حرکت ناگوار گزری اور زرکوئیت کو برا بھلا کہنے لگی۔ نہ صرف اس نے برا بھلا کہا۔ بلکہ یہ بھی کہا۔ کہ اگر تم کو مجھ سے محبت کرنا ہے تو فلینی سے بھی محبت کرنا پڑیگی اور فلینی کی بھی اتنی ہی عزت کرنا پڑیگی۔ جتنی میری کرتے ہو۔"

زرکوئیت کہنے لگا۔ "تمہارے لب میرے سوا اور کسی کے لبوں کو نہیں چھو سکتے۔"

اس پر سیفو بگڑنے لگی۔ اور دونوں میں کافی جھگڑا ہوگیا۔

دوسرے دن تمام یونان یہ خبر سن کر چونک اٹھا۔ کہ نوعمر شہزادے زرکوئیت کی لاش زیر دفنیا کی ندی میں تیرتی ہوئی دیکھی گئی ہے۔

سیفو کو زرکوئیت کی موت کا بہت غم ہوا۔ اور اس نے بصد حسرت و یاس اپنے نوخیز محبوب کو دفن کردیا۔ اور اس کی قبر پر سنگ مرمر کا ایک نہایت نفیس مقبرہ تعمیر کرادیا۔

ہم نے متذکرہ بالا الفاظ میں سیفو کی رومانی زندگی کے صرف دو رخ دکھائے ہیں ورنہ اس عالی مرتبت شاعرہ کی تمام تر زندگی بہت رنگین رہی ہے۔ اسے نوجوانوں سے وفا کا عہد کرنے اور پھر اسے توڑ دینے میں ایک خاص لطف آتا تھا۔ وہ چاہتی تھی۔ کہ یونان کا ہر نوجوان اس کے قدموں پر گر کر اس سے محبت کی بھیک مانگے۔ اپنے حسن کی تعریف کرانا اور عاشقوں کی درد بھری التجائیں سننا اس کی روحانی غذا تھی۔ کئی نوجوان

اس کے دامِ فریب میں اسیر ہوتے تھے۔ اور اپنی جگہ پر ہر نوجوان یہی سمجھتا تھا۔ کہ سیفو مجھ
پر فدا ہے۔ لیکن جب حقیقت بے نقاب ہو جاتی تھی۔ اور سیفو کسی دوسرے نوجوان
کے ساتھ چاندنی رات میں کشتی کی سیر کرنے کے لئے چلی جاتی تھی۔ یا کسی اور نوجوان کی طرف
چشمِ التفات کر لیتی تھی۔ تو دامِ محبت میں اسیر نوجوان خودکشی کر لیتا تھا۔ عجیب بات یہ ہے۔
کہ سیفو سے جس نوجوان نے عشق کیا۔ بعد میں اسے خودکشی کرلینی پڑی۔ سیفو سے جسے
بھی عشق ہوتا تھا شدید قسم کا ہوتا تھا جس نوجوان کی محبت کو بھی اس نے ٹھکرا دیا۔ اسکے لئے
خودکشی کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ سینکڑوں پروانے اس کی شمعِ رخ پر نثار ہو گئے۔

سیفو نے کئی دل توڑے تھے۔ اور کئی نوجوان اس کے عشق کی آگ میں جل کر
راکھ ہو گئے تھے۔ لیکن کسے خبر تھی۔ کہ سنگدل سیفو کا انجام خود بھی کس قدر
خوفناک ہونے والا ہے۔

ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ کہ سیفو کے عہد میں یونان کے مرد زیادہ تر امرد پرستی
کی طرف راغب تھے۔ اور عورتیں عورتوں سے عشق کرتی تھیں۔ ہم یہ بھی لکھ چکے ہیں۔ کہ
سیفو کو فینی نامی ایک لڑکی سے عشق تھا۔ سیفو اپنی محبت کے دام میں صرف مردوں
ہی کو اسیر نہیں کرتی تھی۔ بلکہ کئی عورتیں بھی اس پر عاشق تھیں۔ عورتوں کے عورتوں
سے عشق کرنے کی وبا ان دنوں زوروں پر تھی۔

سیفو کی محبوبہ فینی کو ایک مرد سے محبت ہو گئی۔ اور اس نے سیفو کی محبت کو ٹھکرا دیا۔
فینی نے کچھ عرصہ بعد اپنے عاشق سے شادی بھی کر لی۔ یہ صدمہ سیفو کے لئے ناقابلِ برداشت
تھا۔ سیفو نے اسے دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن فینی سیفو سے بھی زیادہ
سنگدل لڑکی تھی۔ اسکے دل پر سیفو کی التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سیفو اس کے عشق میں دیوانی
ہو گئی۔ اسکی آٹھ راتیں فینی کی سرد مہری اور بیوفائی پر آنسو بہاتے گزریں۔ فینی خود تو
اب سیفو سے ملنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ مگر سیفو نے اس کے گھر اپنے کئی دوستوں

اور اپنی کئی سہیلیوں کو بھیجا کہ وہ ایک مرتبہ فینی کو لے آئیں۔ لیکن فینی نے اس کے گھر آنے سے انکار کر دیا۔ سیفو نے کئی مرتبہ پیغام بھیجا۔ کہ وہ صرف ایک مرتبہ اسے اپنی شکل دکھا جائے۔ لیکن فینی کسی طرح اس کی بات نہ مانتی تھی۔

یہ زمانہ سیفو کی زندگی کا سب سے زیادہ دردناک دور تھا۔ سیفو فینی کے بغیر ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی۔ اس زمانے میں فینی کی سنگدلی اور بے مہری پر بے شمار نظمیں لکھ ڈالیں۔ ان نظموں میں اس قدر سوز، درد اور تاثیر تھی۔ کہ پڑھنے والے بیتاب ہو جاتے تھے۔ لیکن سیفو ایسی نظمیں لکھنے کے باوجود فینی سے محروم رہی۔

آخر سیفو کے عشق نے نہایت ہی درد انگیز صورت اختیار کر لی۔ اور صحیح معنوں میں فرطِ رنج و غم سے پاگل سی ہو گئی۔ وہ اپنے معتقد اور شیدائی ادیبوں اور شاعروں کو بھول گئی۔ اب شاعرہ کے گھر میں وہ بارونق محفلیں نہیں جمتی تھیں۔ سیفو کا قیصر مرمریں اب اجڑا سا گیا۔ کچھ مدت کے بعد جب سیفو کے عشق نے جنون کی صورت اختیار کر لی۔ تو وہ بے حال ہو کر جنگلوں اور وادیوں میں ماری ماری پھرنے لگی۔ لوگ جب فینی کو بتلاتے کہ تمہاری سیفو دیوانی ہو گئی ہے۔ اور جنگلوں میں ماری ماری پھرتی ہے۔ تو فینی کہتی "اس میں میرا کیا قصور ہے"۔

لیکن سیفو جنگلوں میں تنہا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے بیسیوں شیدائی مرد اور عورتیں بھی ہوتی تھیں۔ آخر ایک دن سیفو نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ وہ یونان کے ایک خوفناک آتش فشاں پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی۔ چوٹی پر سے بہت دور فینی کا سفید مکان نظر آتا تھا۔ اس نے اس مکان پر حسرت بھری آخری نگاہ ڈالی۔ پہاڑ کی چوٹی کے نیچے گہرائی میں دہکتے ہوئے لاوے کا ایک خوفناک چشمہ ابل رہا تھا۔ یونان کی اس حسین ترین عورت اور دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ نے جب کے ہزاروں چاہنے والے تھے۔ پھر ابلتے ہوئے سرخ سرخ لاوے کو دیکھا۔ اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لیکن وہ یکایک آنکھیں بند کر کے اس کھولتے ہوئے لاوے میں کود پڑی - اور جس طرح دہکتے ہوئے کوئلوں پر پھول کی پتی پھینکی جائے - اور وہ پل بھر میں فناہ ہو کر رہ جائے اسی طرح دنیا کی یہ حسین ترین عورت اور یونان کی بہترین شاعرہ اُبلتی ہوئی آگ کے سمندر میں بھسم ہو کر رہ گئی ——— تھوڑی دیر کے لئے لاوے کے چشمے سے کچھ دھواں سا نکلا - لیکن اس کے بعد پھر پہلی سی خوفناک آواز پیدا کر کے اُبلنے لگا -

یونان پر اس خوفناک حادثے سے ایک ہیبت طاری ہو گئی - اور لوگ جوق در جوق اس پہاڑ کو دیکھنے کے لئے آنے لگے جس نے سیفو کو اپنے آغوش میں چھپا لیا تھا - سیفو تو لاوے میں بھسم ہو گئی تھی - اب اس لاوے میں سیفو کے ہزاروں چاہنے والے مردوں اور عورتوں کے آنسو گر رہے تھے -

کائنات پر اُداسی چھا گئی - ہوائیں سسکیاں لینے لگیں - اور موسم بہار کا سورج ہچکی لے کر پہاڑوں سے پرے شفق کی جھیل میں غروب ہو گیا ——— کیونکہ آج گلشن یونان کا سب سے خوبصورت پھول مرجھا گیا تھا -

ماتم کرنے والوں کا مجمع ابھی پہاڑ سے نیچے اتر ہی رہا تھا - کہ یکایک کچھ دھماکا سا ہوا اور ایک نوجوان جو باچشم پُرنم پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑا لاوے کے اس طوفان کو بصد یاس و حسرت دیکھ رہا تھا - جس کے حوالے سیفو نے اپنا خوبصورت جسم کر دیا تھا - لاوے میں کود پڑا -

اس نوجوان کو سیفو سے عشق تھا - لیکن اس نے کبھی اس سے عشق کا اظہار نہ کیا تھا - اس نے بھی اس کی محفلوں میں شرکت کی تھی - لیکن اسے سیفو سے سچی محبت تھی اس دنیا میں وہ اپنے عشق میں ناکام رہا تھا - اب وہ دوسری دنیا میں سیفو کی روح کے تعاقب میں روانہ ہو گیا ——— یہ تھا یونان کی ملکۂ حسن و آتش نوا شاعرہ کا انجام !

ڈنمارک کی پری

(۱)

ماضی کی حسین وجمیل وادی میں سمندر کے کنارے جہاں جنگل اور سمندر کا ملاپ ہوتا تھا۔ ڈنمارک کی عالم و فاضل ملکہ جوآنا کا پرشوکت محل کھڑا تھا۔

آج وہ ملکہ تھی۔ لیکن کبھی وہ دن بھی تھے۔ جب وہ ڈنمارک کے ایک چھوٹے سے گاؤں جوگت میں اپنے بھائی کے ساتھ بھیڑیں چرانے جایا کرتی تھی۔

آج اطلس دکمخواب اور دیبا و حریر اس کے برق پاش جسم کی بلائیں لے رہے تھے۔ آج وہ محل کی فضاؤں میں بجلی کی طرح کوندتی پھرتی تھی۔ جب کسی کے سامنے سے گزرتی۔ تو اسے یوں معلوم ہوتا۔ جیسے ایک متحرک شعلہ گزر گیا ہے۔ وہ شوخی اور رعنائی کی مکمل تصویر تھی۔ اس کی پُرغرور نگاہوں کے تیر دلوں میں پیوست ہو کر رہ جاتے تھے۔ اور اس کی شوخ وحسین ادائیں نگاہوں پر حیا اور پھول برساتی تھیں جب وہ اپنی پتلی سی نازک کمر لچکاتی ہوتی اپنے خوبصورت کولھوں کو ہلکی ہلکی شوخ جنبشیں دیتی ہوئی فضاؤں کو خوشبو سے معطر کرتی بجلی کے ایک چمکارے کی طرح گزر جاتی۔ تو بادشاہ پر تھوڑی دیر کے لئے سرور کی کیفیت طاری ہو جاتی ——— اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے موسم بہار کی حسین تتلی اڑتی ہوئی اس طرف سے اس طرف نکل گئی ہے ——— یا پرستان کی ملکہ ایک لمحہ کے لئے اپنی جھلک دکھا کر چلی گئی ہے۔ یا بجلی بادلوں سے نکل کر عورت کے روپ میں گزر گئی ہے۔

بادشاہ [illegible] بادشاہ تھا۔ حکومت تو جوآنا کرتی تھی ——— ڈنمارک [illegible]

اور بادشاہ کے دل پر بھی! محل میں کئی عورتیں تھیں۔ جن کے پاس حساس دل بھی تھے۔ اور جنہوں نے سانولی سالونی خوشبودار زلفوں کے ناگ بھی پال رکھے تھے۔ اور ان ناگوں کے ڈسے ہوؤں کی جان بچانے کے لیے ان کے رس بھرے شیریں ہونٹ آبِ حیات کا کام بھی دے سکتے تھے۔ بادشاہ کے سر کو آرام دینے کے لیے ان کے پاس دودھ کے سے سفید اور سنبل کے سے کومل سینے بھی تھے۔ طوق در گلو ہونے کے لئے گدرائے ہوئے عریاں بازو بھی۔ شوخ ادائیں بھی۔ ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی آنکھیں بھی۔ لیکن اس بات کا کیا علاج کہ جو آنا بادشاہ کو ایک خوبصورت ناگن، ایک حسین ساحرہ، ایک دلکش پری، بلکہ ایک پرانی حور کی طرح خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ وہ بیوی یا ملکہ سمجھ کر اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یونانی دیوی وینس سمجھ کر اس کی پرستش کرتا تھا۔

ملکہ جب عطر میں مہکا ہوا سیمیں و زریں چست اور باریک لباس پہن کر ہونٹوں کو یاقوت کے شیریں ٹکڑوں کی طرح حسین بنا کر مژگاں کو زہر میں بجھی ہوئی کالی سوئیوں کی طرح تیز کر کے سینے پر محبت طلب جذبات کا ہیجان آفریں تموج لئے ہوئے خواب گاہ میں آتی تو بادشاہ تھرا جاتا۔ اور جب وہ اپنے مخملیں بستر پر بیٹھ جاتی۔ اور کافوری قندیلوں کی جگمگاتی ہوئی کرنیں اس کے نورین دُھلے ہوئے شریر بادلوں اور قیامت آفریں سینے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگتیں۔ تو بادشاہ اس طرح کانپتا ڈرتا ہوا اس کی سمت بڑھتا جیسے کوئی پھٹے پرانے لباس والا ادنیٰ بھکاری کسی لعبتِ فرنگ کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے یا اس سے ہمکنار ہونے کے لئے بڑھتا ہے۔ یا جیسے کوئی گنہگار دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کسی کی بیوی کے ہونٹوں سے اپنے کانپتے ہوئے ہونٹ ملانے کے لئے اس پر جھکے اور اسے ہر آن اس کے شوہر کی آمد کا کھٹکا لگا ہو۔

وہ بھی بادشاہ کے دل کے راز کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا اور جب وہ اپنے شریک حیات پر گھبراہٹ کی کیفیت طاری دیکھتی۔ تو اس کے ادا

پر ایک لطیف مسکراہٹ کھیل جاتی۔ بادشاہ اس کی کھلی ہوئی آغوش میں بے اختیار اس طرح گر جاتا جیسے شمع کی آغوش میں پروانہ گرتا ہے۔ جب ملکہ کے شیریں ہونٹ بادشاہ کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے مل جاتے تو بادشاہ کو یوں محسوس ہوتا جیسے کسی زہریلی اور خوبصورت ناگن کی زبان اس کے ہونٹوں کو چاٹ رہی ہے۔ اس پر ایک نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔ اور وہ اپنے جسم کی تمام تر کرختگی کو حسین ملکہ کے سینے کی زیروبم میں جذب کر دینے کے لئے بیقرار ہو جاتا۔

اس وقت اس کی حالت ایک بچے کی سی ہوتی اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ بادشاہ بالکل نوخیز تھا۔ اور اس کی بیوی یعنی ملکہ جوآنا اس سے چار سال بڑی تھی —— بادشاہ پر ملکہ کے رعب کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی۔ اور اگر ملکہ کی شوخ ادائیں اور بازوؤں کی شرارت بادشاہ کو زبردستی محبت کی رات بسر کرنے پہ مائل کرتیں۔ تو شاید حسن سے خوف کھانے والے بادشاہ کو کبھی اپنی بیوی کے حسن نازنین سے بہرہ یاب ہونے کا موقع نہ ملتا۔

جوآنا حسن و رعنائی کی ایک زندہ تصویر تھی۔ اس کے حسن نے دیہات میں پرورش پائی تھی۔ اور محل میں آ کر اس کی شوکت میں سو گنا اضافہ ہو گیا تھا

—————— (۴) ——————

یہ دیہاتی حسینہ کس طرح بادشاہ کے محل میں آئی؟ یہ داستان بھی بے حد دلچسپ ہے۔ ایک دفعہ ڈنمارک کا نوخیز بادشاہ جوگ کے جنگلوں میں سوروں کا شکار کھیل رہا تھا کہ شکار کھیلتے کھیلتے رات نے آ گھیرا۔ ساتھ والے مصاحبوں نے رائے دی کہ آج رات جنگل ہی میں بسر کی جائے۔ چنانچہ وہیں ایک مختصر سا خیمہ گاڑ دیا گیا۔ شکاریوں کے پاس نمک نہیں تھا۔ بادشاہ کہنے لگا۔ میں خود گاؤں سے نمک لاؤں گا۔ چنانچہ وہ اپنے ایک مصاحب کے ہمراہ گاؤں کی طرف چل دیا۔ اتفاق کی بات کہ وہ سیدھے جوآنا ہی کے گھر

پہنچا۔ اس وقت جوآنا کی عمر کوئی اکیس برس کے قریب تھی۔ گاؤں والوں کو کیا خبر تھی۔ کہ آج بادشاہ جنگلوں میں بھٹک رہا ہے۔ ورنہ ممنونِ نمک وہ خود جنگل میں اٹھا لاتے۔ بادشاہ جب جوآنا کے گھر میں داخل ہوا۔ تو وہ اپنے بھائی کے ساتھ چولھے کے قریب بیٹھی تھی۔ بادشاہ نے نمک کی فرمائش کی۔ تو اس نے مٹھی بھر پسا ہوا نمک، بادشاہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بادشاہ نے کہا۔ اور چاہیئے۔ میرے ساتھ بہت سے آدمی ہیں۔ جوآنا نے شرارت سے مسکرا کر چٹکی بھر نمک، اور اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ بادشاہ نے کہا۔ "مجھے تو اور چاہیئے"۔ حسینہ بولی۔ "تو دونوں ہاتھ آگے بڑھاؤ۔ بادشاہ نے دونوں ہاتھ ملا کر آگے بڑھا دیئے۔ جوآنا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ساری کی ساری نمکدانی اس کے ہاتھوں پر الٹ دی۔ بادشاہ نے اپنی جھکی ہوئی آنکھوں کو اٹھایا تو دیکھا۔ جوآنا کے ہونٹوں پر ایک شریر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ اور شمع کی دھندلی دھندلی روشنی میں اس کی جگنوؤں کی سی آنکھیں جگمگا رہی ہیں۔ بادشاہ کو جوآنا کی یہ ادا ایسی بھائی۔ کہ غریب مٹھی بھر نمک کے بدلے اپنا دل حسینہ کی سانولی زلفوں میں پھنسا آیا۔

صبح جب یہ لوگ کوچ کی تیاری کر رہے تھے۔ تو بادشاہ شکریہ ادا کرنے کے لئے جوآنا کے گھر گیا۔

جوآنا ایک لگاوٹ آمیز غرور کے ساتھ اس سے پیش آئی۔ اب کی بادشاہ وہاں سے واپس آیا تو ہوش و خرد بھی وہیں بھول آیا۔ جب یہ سب لوگ چلے گئے تو لوگوں کو معلوم ہوا۔ کہ ڈنمارک کا بادشاہ کل رات گاؤں میں نمک کی بھیک مانگتا رہا۔ گاؤں بھر میں سنسنی سی پھیل گئی۔ لیکن جوآنا پھر بھی ویسی کی ویسی ہی پُر غرور تھی۔ وہ بڑے فخر کے ساتھ لوگوں کو بتاتی۔ کہ میں نے بادشاہ کے ساتھ کیا شرارت کی۔

جوگ کے جنگلوں میں بھٹکنا اب شاہِ ڈنمارک کا معمول ہو گیا۔ اب وہ جوآنا کے بھائی کو بھی اپنے کیمپ میں بلا لیتا۔ اور کبھی کبھی جوآنا بھی وہاں آ جاتی۔ اب جوآنا کے

گھر والوں کی قسمت کا پانسہ پلٹ گیا۔ اس کے گھر کے ہر فرد پر بادشاہ کی نگاہ لطف پڑنے لگی۔ بادشاہ کی طرف سے اب ان لوگوں کو مالی امداد ملنے لگی۔ اب ان غریب لوگوں کے گھر میں جنہیں بمشکل دو وقت کھانا ملتا تھا۔ گھی کے چراغ جلنے لگے۔ روز بروز ان لوگوں کو اب شاہی قرب میسر ہونے لگا۔

جوآنا کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ بادشاہ اسے دل دے بیٹھا ہے۔ لیکن نوخیز بادشاہ سے روز بروز اس کی دلچسپی بڑھتی جاتی تھی۔ اور ایک عجیب بات یہ تھی مگر جوآنا نے کبھی بادشاہ کو بادشاہ سمجھ کر اس کی عزت نہ کی۔ وہ اس سے اس طرح پیش آتی۔ جیسے ہم رتبہ دوست باہم ایک دوسرے سے پیش آتے ہیں۔ وہ ایک ایسی آزاد چڑیا تھی جسے پنجرے میں بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چونکہ اب ان لوگوں کو ذریعہ معاش کی کوئی فکر نہ تھی۔ اس لئے انہوں نے بکریاں چرانے کے لئے نوکر رکھ لئے۔ اور خود ان لوگوں کا وقت زیادہ تر بادشاہ کی معیت میں بسر ہونے لگا۔

اب جوآنا پھٹا پرانا لباس نہیں پہنتی تھی۔ اس کا لباس گاؤں بلکہ شہر کی امیر سے امیر عورتوں کے لباس سے بہتر ہوتا تھا۔ امارت نے اس کے حسن اور غرور کو چار چاند لگا دیئے۔ اور اب وہ پُر غرور حسن کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی۔

جب بادشاہ جنگل میں شکار کھیلنے آتا۔ تو جوآنا اور اس کا بھائی بھی کیمپ میں ہوتے۔ بادشاہ سے جوآنا کی بے تکلفی کا اب یہ عالم تھا۔ کہ وہ بات بات پر بادشاہ سے روٹھ جاتی اور بادشاہ اُسے اپنی ہم رتبہ عورت سمجھ کر گھنٹوں مناتا رہتا۔ وہ شاہی رعب اور دبدبے سے بالکل مرعوب نہیں ہوتی تھی۔ اور اس کی پُر غرور ادائیں بادشاہ کو دل سے پسند تھیں۔

اپنے حسن اور آنسوؤں کی مدد سے عورت دنیا میں کیا کچھ نہیں کر سکتی جوآنا کے پاس یہ دونوں چیزیں تھیں حسن بھی اور آنسو بھی۔ جب نوخیز بادشاہ سے

کسی بات پر اس سے جھگڑا ہو جاتا۔ تو ایک دلفریب ادا کے ساتھ وہ روٹھ جاتی اور اپنا خوبصورت چہرہ اپنے پھول سے پیارے ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگتی ـــــــ بادشاہ اسے آزردہ دیکھ کر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا۔

رفتہ رفتہ جوآنا نے اپنے حسن اور آنسوؤں کی مدد سے بادشاہ کے باغ دِل و دماغ اور ہوش و حواس کو بُری طرح جکڑ لیا۔ ایک ایسی عورت کے لئے جو عمر میں اپنے محبوب سے بڑی ہو کسی نوخیز نوجوان کو اسی طرح اپنے دام محبت میں اسیر کر لینا مشکل نہیں ہوتا۔ بادشاہ کی اب یہ حالت ہو گئی کہ وہ ایک لمحے کے لئے بھی جوآنا کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

جوآنا نے گاؤں میں بدنام ہونے کے خیال سے اور یہ سوچ کر کہ بادشاہ سے دوستانہ تعلقات رکھنے کی وجہ سے گاؤں کے لوگ اس کے چال چلن پر طعنہ زنی نہ کریں۔ بادشاہ سے کہہ کر گاؤں کا مالیہ معاف کرا دیا۔ اور گاؤں والوں کو اور بھی کئی مراعات لے دیں۔ دنیا دولت اور مرتبے سے بہت مرعوب ہو جاتی ہے۔ جب گاؤں والوں نے دیکھا کہ جوآنا بادشاہ کی منظور نظر ہے۔ تو وہ بھی اس سے مرعوب ہو کر اس کی خوشامدیں کرنے لگے۔

اب جوآنا بادشاہ کے دِل و دماغ اور روح کی مالکہ تھی۔

(۳)

بوگ کے جنگلوں میں اب بادشاہ نے ایک چھوٹا سا محل بنوا لیا تھا۔

ـــــــ نصف شب گزر چکی تھی۔ جوآنا اور نوخیز بادشاہ کے سوا محل کے تمام لوگ سو چکے تھے۔ یہ دونوں اس وقت خوابگاہ میں تھے۔ اس وقت بادشاہ کا عشق اور جوآنا کا حسن غرور انتہائی عروج پر تھا۔

جوآنا ایک مکمل عورت تھی وہ عورت کی فطرت کا ایک مکمل نمونہ تھی۔ مرد سے

اپنی خوشامدیں کرانا، اپنے حسن کی تعریفیں سننا، اور مرد کو آتشِ رقابت میں جلتا دیکھنا۔ اس کی روح کی غذا تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ میرے محبوب کے عشقیہ جذبات پورے جوش کے ساتھ بھڑک رہے ہیں۔ تو اس نے آتشِ عشق کے ان شعلوں کو رشک اور رقابت کی ہوا دینی شروع کی۔

اس نے بادشاہ کو گاؤں کے اس نوجوان کا قصہ سنایا جس کے ساتھ اس نے اپنے بچپن کا زمانہ گزارا تھا جس کے ساتھ مل کر وہ سیریں کرتی رہی تھی۔ اور جو ایک مرتبہ روتے روتے اس کے قدموں پر گر گیا تھا۔ اس نے بادشاہ کو یہ بھی بتایا کہ وہ اس کی درد انگیز التجاؤں سے بہت متاثر ہوئی اور اب تک اس کے دل میں اس نوجوان کے خلوص آمیز جذبات کی قدر ہے۔ اس کے بعد جوآنا نے اس نوجوان کی تعریفیں کرنا شروع کیں۔ بادشاہ کا چہرہ متغیر ہونے لگا۔ اور جوں جوں جوآنا اپنے محبوب کا چہرہ متغیر دیکھتی وہ اس نوجوان کی زیادہ سے زیادہ تعریفیں کرتی جاتی۔

اب جو جوآنا نے نظر اٹھائی۔ تو اس نے دیکھا کہ بادشاہ اپنی محبوبہ کی زبانی اپنے "رقیب" کی تعریفیں سننے کی تاب نہ لاتے ہوئے روٹھ کر وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا ہے اور کھڑکی کھول کر باہر جھانک رہا ہے۔

جوآنا نے ایک نقرئی قہقہہ لگایا اور کہنے لگی "اوہو! ہمارے بادشاہ سلامت ناراض ہو گئے ہیں"۔ اس کے بعد اس نے اس کے شانے پر اپنا عطر میں بسا ہوا نازک ہاتھ رکھ دیا۔ اور اسے پکڑ کر واپس اس کے بستر پر لے آئی۔

جب جوآنا نے پہلی مرتبہ بادشاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور مسکرا کر اپنی خوبصورت اور شریر نگاہیں بادشاہ کی آنکھوں میں ڈالیں۔ تو نوخیز بادشاہ کا غصہ کافور ہو گیا۔

آج پہلی مرتبہ بادشاہ نے جوآنا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اسے اپنے ہونٹوں سے لگانا چاہا۔ جوآنا کا دل دھڑکنے لگا۔ اور اس نے جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ نوخیز

بادشاہ کے دل میں رشک اور محبت کے جذبات نے ایک طوفان اٹھا رکھا تھا۔ اس نے اپنے دونو بازو آگے بڑھائے۔ اور پوری قوت کے ساتھ بجلی کی طرح اس حسینہ کو اٹھا کر اپنی آغوش میں بٹھا لیا۔ جوآنا تڑپ کر اس کی آغوش سے علیحدہ ہو گئی۔ نوخیز بادشاہ نے آگے بڑھ کر اس کا منہ چومنا چاہا۔ لیکن جوآنا نے ہر مرتبہ اپنا منہ اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ تھوڑی سی کشمکش کے بعد بادشاہ نے تھک ہار کر کہا "کہ اگر تم مجھے آج رات اپنا منہ چوم لینے دو گی۔ تو میں اپنی آدھی سلطنت تمہیں دیدوں گا۔" یہ کہہ کر بادشاہ نے پھر اپنے کانپتے ہوئے لب جوآنا کے خوبصورت لبوں سے ملانے چاہے۔ لیکن جوآنا اپنی ضد پر قائم رہی۔ وہ آدھی سلطنت کو کیا کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ آدھی کیا پوری سلطنت بادشاہ اس کے قدموں پر نثار کرنے والا ہے۔ اگر وہ آج رات اپنے لبوں سے بادشاہ کو آب حیات پلا دیتی۔ تو بہت ممکن تھا کہ نوخیز بادشاہ کی آتش عشق یا تو بالکل بجھ جاتی۔ یا سرد پڑ جاتی۔ وہ خود اس وقت بادشاہ کی آغوش میں پناہ لینے کے لئے بے قرار تھی۔ لیکن ساتھ ہی وہ جانتی تھی۔ کہ آج کی رات کا "انکار" اس کی آئندہ راتوں کو وصل کی لذتوں سے سیمیں و زریں بنا دے گا چنانچہ وہ اپنے ارادوں پر استقلال سے قائم رہی۔ اس نے اپنے محبوب سے صاف صاف کہہ دیا۔ کہ جب ہم ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائیں گے۔ تو پھر تم میرے جسم کے مالک بن سکتے ہو ——— ابھی میرے لئے تمہاری حیثیت ایک اجنبی اور غیر مرد کی سی ہے۔

——— ۴ ———

آج جوآنا ملکہ بن چکی تھی۔ تمام سلطنت میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں اس خوشی میں ڈنمارک کے تمام بازار آراستہ کر دیئے گئے تھے۔ امراء وزراء اور ارباب حکومت شادی کے جشن میں خوشیاں منا رہے تھے۔

شاہی محل کی خوابگاہ پر آج ایک تجلی زار کا گمان ہوتا تھا۔ رات روزِ روشن معلوم ہوتی تھی۔ جو آنا عطر اور تجلی کے دریا سے نہا کر آئی ہوتی ایک گلفام پری معلوم ہوتی تھی۔ اس نے آج ایک ایسی پوشاک پہن رکھی تھی۔ جس نے اس کے جسم کے صرف نصف حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اور اس کا گورا گورا جسم اس کے چُست باریک اور رنگین لباس میں چمک رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ ستاروں کی شعاعوں کو گوندھ کر اس کے جسم میں جذب کر دیا گیا ہے۔ اس نے آج اپنے خوبصورت گالوں کو خوشبودار اور ہونٹوں کو خونِ کبوتر کی طرح سرخ بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ سینے کے دلکش ابھار نیا امت ڈھا رہے تھے۔ غرضیکہ وہ حُسن اور عظمت کی ایک ایسی تصویر معلوم ہو رہی تھی جس سے فرشتوں کو بھی ہم آغوش ہونے کی جرأت نہ ہو سکے۔

نوخیز بادشاہ نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور کہنے لگا۔ تمہیں یاد ہے وہ رات جب کہ جوگ کے جنگل میں میرے بازوؤں اور میرے ہونٹوں نے تم سے شرارت کرنی چاہی تھی۔ اس وقت تم ایک غیر عورت تھیں۔ اب تم میری ملکہ ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں اب میں تم سے ہم آغوش ہونے سے ڈرتا ہوں میں سوچتا ہوں۔ اگر میرے لب تمہارے لبوں سے پیوست ہو گئے۔ تو تمہارے ہونٹوں کا بجلی کا سا مَس مجھے فنا کر دے گا۔ تمہارے خوشبودار گالوں کا ہر مہکتا ہوا بوسہ مجھ پر ایک مرگ آفریں نشہ طاری کر دے گا۔ تمہاری خوشبودار سانس میرے مشام جاں پر ایک نشہ بلا اور لذت آفریں مردنی طاری کر دے گی۔ اور اگر میں تم سے ہم آغوش ہو گیا۔ تو میری روح تمہارے گورے گورے چمکیلے جسم میں ہمیشہ کے لئے جذب ہو کر رہ جائے گی۔

ملکہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور اس نے اپنی نگاہیں حیا سے نیچی کر کے

اپنے دونوں بازو بادشاہ کی طرف پھیلا دیئے۔ نوخیز بادشاہ کو ملکہ کے گدرائے ہوئے پُر شباب جسم نے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا۔ دو دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے جسم ایک لمحے میں ایک دوسرے سے مل گئے۔ ملکہ لڑکھڑائی۔ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اور اپنے بستر پر جس پر پھول ہی پھول بچھے تھے۔ ایک نازک کلی کی طرح گر گئی۔

بادشاہ کے جسم کے ساتھ دو عریاں بازو لپٹے تھے۔ اس طرح جیسے کسی حسین ناگن نے کسی کو جکڑ رکھا ہو۔ سفید ریشمی تکیے پر جوآنا کی خوشبو دار زلفیں بکھر کر کالی گھٹاؤں کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ بادشاہ اور ملکہ دونوں کے سینوں کو ایک دوسرے کے دِل کی دھڑکن محسوس ہو رہی تھی۔ اور دونو ایک دوسرے کی خوشبو دار سانس کی آواز سُن رہے تھے۔ بادشاہ کے لب جوآنا کے شیریں لبوں سے مل گئے۔ اور نجانے کتنی دیر تک ملے رہے۔ جوآنا نے پہلی مرتبہ ایک مرد کا اور بادشاہ نے پہلی مرتبہ ایک عورت کا اس قدر طویل بوسہ لیا۔ جوآنا اپنے محبوب کو بھینچ بھینچ کر پیار کرنے لگی۔ اس کے ہیجان آفریں جسم اور سینے کے لمس سے بادشاہ کے دل و دماغ پر ایک مدہوشی سی طاری ہو گئی۔ اور جوآنا کے آتشیں بوسوں کے نشیلے زہر سے بیخود و سرشار ہو کر اپنے آپ کو بالکل بھول گیا۔ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔ کہ اب کیا ہو رہا ہے۔

صبح جب دونوں کی آنکھ کھلی تو ملکہ نے شرما کر اپنے جسم کو ایک ریشمی چادر میں چھپا لیا۔ اور بستر کی شکنوں اور باسی پھولوں کو شرمائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ بادشاہ نے پھر اسے اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ اس کے منہ سے چند اضطراری چیخیں نکل گئیں۔ ـــــ ایسی چیخیں جو عورت کے منہ سے اس وقت نکلتی ہیں۔ جب وہ انتہائی شرم و حیا محسوس کرے۔ اور اسے خطرہ ہو کہ کوئی اس کا پردہ حیا اٹھا دینے والا ہے۔

(۵)

پہاڑ سی کالی رات سر پر کھڑی تھی۔ ہوا سیٹیاں بجا رہی تھی۔ آندھی نے کئی درخت اکھاڑ پھینکے تھے۔ لیکن ابھی اس کا زور ختم نہیں ہوا تھا۔

ملکہ ایک ویران سڑک پر تیزی سے قدم اٹھاتی گھبرائی ہوئی جا رہی تھی۔ اور کبھی کبھی وہ دوڑنے بھی لگتی۔ چاروں طرف جنگل پھیلا تھا۔ اور سڑک پر سوائے اس کے اور کسی انسان کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیتا تھا۔

بادشاہ چند دن کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ اور وہ اکیلی تھی۔ اس کی منزل مقصود اس وقت بہت دور تھی۔ لیکن اسے اس جنگل کی ایک ایک راہ سے واقفیت تھی۔ اور تاریکی اور آندھی کے اس خوفناک طوفان میں بھی وہ راستہ نہ بھول سکتی تھی۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں اپنے پرانے محبوب فرلون کا تصور تھا۔ جس کی زندگی اس نے تباہ کر دی تھی۔ وہ جوآنا کے گاؤں کے "نمبردار" کا بیٹا تھا۔ اس کے ساتھ وہ بکریاں چرانے جایا کرتی تھی۔ دونو ایک دوسرے کے انتہائی دوست تھے۔ اور دونو میں شادی کے وعدے ہو چکے تھے۔ فرلون جوآنا پر دل و جان سے فدا تھا۔ وہ جوآنا کے والدین کو وقتاً فوقتاً مالی امداد بھی دیا کرتا تھا۔ اور کئی مصیبتوں میں وہ جوآنا کے کام آچکا تھا۔ جوگ کے جنگل کے محل میں جوآنا نے بادشاہ سے اسی کی تعریفیں کی تھیں۔ جس پر بادشاہ آتش زیر پا ہو گیا تھا۔

جوآنا فرلون کے احسانات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی تھی۔ بادشاہ سے ملاقات کرنے سے پہلے وہ دونوں عاشق اور محبوبہ کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن جب جوآنا کے حسن کی وادی میں خود ڈنمارک کے بادشاہ نے قدم رکھا۔ تو ایک غریب بھکاری یعنی فرلون کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ جوآنا سے اس کی تمام التجائیں اور منتیں بیکار گئیں۔ پہلے تو جوآنا اسے تسلیاں دیتی رہی کہ میں بادشاہ سے یونہی ملتی ہوں۔ مجھے اس سے محبت نہیں

اور واقعی پہلے پہل جوآنا بادشاہ سے کسی خاص روحانی جذبے کے ماتحت نہیں ملا کرتی تھی۔ لیکن بعد میں رفتہ رفتہ بادشاہ پر اس کا دل مائل ہونے لگا۔ فرلون غریب تھا۔ اور بادشاہ تو بہر حال بادشاہ تھا۔ جب اس نے جوآنا کے گھر والوں کو مالی امداد دینی شروع کی تو ان لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو گیا۔ اور شاہی خاندان کے قرب کی وجہ سے وہی فرلون جو کبھی جوآنا کے دل کا قرار تھا۔ اس کے راستے کا کانٹا معلوم ہونے لگا۔

اب بادشاہ کی طرف اس کا دل مائل ہونے لگا۔ وہ پُرشکوہ محلات کے خواب دیکھنے لگی۔ اسے اپنے محبوب پر ترس بھی بہت آتا۔ لیکن عورت اپنی فطرت کو کس طرح بدل سکتی ہے۔ وہ امارت کے سنہری جال میں بُری طرح اسیر ہو گئی۔

جب فرلون آ آ کر روتے ہوئے اس کے قدموں پر گرتا۔ تو جوآنا کو اسکے احسانات اور ہمدردیاں یاد آ جاتیں۔ وہ سوچتی کہ کس طرح بیماری کے دنوں میں فرلون نے اسکی خدمت اور تیمارداری میں دن رات ایک کر دیئے تھے۔ فرلون کی حالت دیکھ کر اسے گزرا ہُوا زمانہ یاد آ جاتا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ لیکن اب وہ مجبور تھی۔ وہی دل جو فرلون کے لئے وقف تھا۔ ایک دوسرے "ڈاکو" نے آ کر چھین لیا تھا۔

اب وہ محل میں تھی۔ ملکہ بن چکی تھی۔ لیکن اپنے سابق محبوب کی مہربانیاں اور درد انگیز محبت اسے نہیں بھولی تھی۔ اب اسے اس کی سہیلیوں نے بتایا تھا۔ کہ فرلون اس کی شادی کے غم اور فراق میں دیوانہ سا ہو گیا ہے۔ وہ اُن راہگزروں کو دیوانہ وار چومتا ہے۔ جہاں سے وہ اکثر گزرا کرتی تھی۔ اور رات رات بھر گاؤں کے باغ میں اور ندی کے کنارے جہاں ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ بھٹکتا رہتا ہے۔ اس کے دل سے صبر و قرار رخصت ہو گیا ہے۔ اور چہرے پر ہوائیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔

جوآنا کو اپنے محبوب کی بے قراریوں پہ صدمہ ہوتا تھا۔ اس نے اس سے شادی کرنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس وعدہ خلافی پر ہر وقت اس کا ضمیر اُسے

ملامت کرتا رہتا تھا۔

آخر ایک دن اس نے بادشاہ سے چوری چھپے اُسے اپنے محل میں بلایا۔ اپنے محبوب کی بُری حالت دیکھ کر اس کا دل پسیج گیا۔ اور وہ زار وقطار رونے لگی۔

فرلون نے اپنے زبردست دلائل سے ثابت کر دیا۔ کہ جوآنا نے اس سے غداری کی ہے۔ جوآنا اس کی ہے ——— صرف اس کی ——— رات بھر کی بحث وتکرار کے بعد جوآنا اس بات پر رضامند ہوگئی۔ کہ وہ کسی خاص موقعہ پر اپنے سابق محبوب کے ساتھ اس کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی میں ایک رات گذشتہ دنوں کی یاد میں بسر کرنے کے لئے تیار ہے۔ جوآنا نے اس سے کہہ دیا۔ کہ ملکہ بننے کے نشے میں اس نے انسانیت کو خیرباد نہیں کہی۔ چونکہ اس کا ضمیر فرلون سے غداری کرنے پر اسے ملامت کرتا تھا۔ اس لئے وہ اپنے سابق محبوب کی پہلی اور آخری خواہش پوری کرنے پر رضامند ہوگئی۔ حالانکہ اس معاملے میں تھوڑی سی بے احتیاطی یا غفلت اس کا مستقبل تاریک کرنے کے لئے کافی تھی۔

آج آندھی کے اس خوفناک طوفان میں اور پہاڑ سی کالی رات میں وہ اپنا وعدہ پُورا کرنے کے لئے آندھی کی سی تیزی کے ساتھ اپنے محبوب کی اس جھونپڑی کی طرف جارہی تھی۔ جو جنگل میں تھی۔ ایک معتبر سہیلی کے ذریعے اس خطرناک ملاقات کا انتظام ہو چکا تھا۔

اس وقت اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ سانس پھُولی ہوئی تھی۔ اور اس کا ریشمی لباس خار دار جھاڑیوں میں اُلجھنے کی وجہ سے جگہ جگہ سے تار تار ہو گیا تھا۔ لیکن اسے آج اپنے مجنوں کی آتشِ عشق کو سرد کرنا تھا۔ وہ دل میں ہیجان خیز جذبات کا ایک طوفان لئے بجلی کی طرح جنگل کی اسی تنہا جھونپڑی کی طرف کھنچی چلی جارہی تھی۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وہم اُمڈ رہے تھے۔ کبھی اُسے

خیال آتا۔ کہ کہیں میری سہیلی نے مجھ سے غداری نہ کی ہو۔ اور تمام حالات سے بادشاہ کو خبردار کر دیا ہو۔ کبھی خیال آتا۔ کہ کہیں بادشاہ کی سواری اسے راستے میں نہ آ ملے۔ کبھی اسے اس بات کا کھٹکا ہوتا۔ کہ کہیں بادشاہ محل میں نہ آ گیا ہو۔ اور اُسے ڈھونڈھ رہا ہو۔

آخر دیا رہ جب آ پہنچا۔ جھونپڑی میں ایک دھندلی شمع جلتی ہوئی اُسے دور ہی سے نظر آ گئی۔ وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں کے ساتھ جھونپڑی کے قریب پہنچی۔ یکایک اُسے ایک متحرک سایہ نظر آیا۔ جس نے جھونپڑی میں جلتی ہوئی شمع گُل کر دی۔

جب اس نے جھونپڑی میں قدم رکھا۔ تو اس کے محبوب نے آتے ہی زبردستی اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

وہ کہنے لگی۔ کہ "تم نے شمع کیوں بجھائی ہے۔ شمع تو روشن کر دو"۔ لیکن اس کے محبوب کی مہر سکوت نہ ٹوٹی۔

وہ بولی "تم خاموش کیوں ہو۔ بولتے کیوں نہیں"۔ اب بھی اس کے محبوب نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر وہ کہنے لگی "اب تو خوش ہو۔ میں نے جان پر کھیل کر تمہاری خواہش پوری کر دی"۔

یکایک جوآنا نے محسوس کیا۔ کہ اس کے محبوب کے عشقیہ جذبات بیدار ہو گئے ہیں۔ اس نے اسے بھینچ بھینچ کر پیار کرنا شروع کر دیا۔ اور اس کے بعد اس نے چاہا۔ کہ جوآنا کو لباس کی قید سے آزاد کر دے۔ کچھ دیر کی کشمکش کے بعد جوآنا اپنا نیم عریاں جسم اپنے محبوب کے سپرد کرنے پر مجبور ہو گئی۔ اور آخر اس جھونپڑی میں وہ بات ہو کے رہی۔ جو محل میں شادی کی پہلی رات کو ہو چکی تھی۔

ابھی جوآنا کے ہوش و حواس بجا نہیں ہوئے تھے۔ کہ اس کا محبوب تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اسے کھینچ کر جھونپڑی سے باہر لے گیا۔

باہر اس وقت بادل گرج رہا تھا۔ اور بجلی چمک رہی تھی۔ اب وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے تھے۔ تاریکی اس قدر تھی۔ کہ دونوں کو ایک دوسرے کا چہرہ تک نظر نہ آتا تھا۔

یکایک بجلی زور سے چمکی۔ جوآنا کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔ کیونکہ اس نے دیکھا۔ کہ اس کے سامنے فرلون کی بجائے بادشاہ کھڑا غصے سے کانپ رہا ہے۔

دفعتاً اندھیرے میں ایک تلوار بجلی کی طرح چمکی۔ اور ملکہ کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ ملکہ ایک چیخ مار کر تڑپتی ہوئی زمین پر آ گری۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار "اُف پیارے فرلون" نکل گیا۔

بادشاہ جسے جوآنا کی غدار کنیز نے تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ وقت مقررہ پر جھونپڑی میں آگیا تھا۔ غدار سہیلی فرلون کی بجائے بادشاہ کو جھونپڑے میں لے آئی تھی۔

یکایک بادشاہ شمع جلا کر جھونپڑی سے باہر لے آیا۔ اب آندھی رک گئی تھی۔ اور بارش ہونے والی تھی۔ اس نے جب شمع کی روشنی ملکہ کے چہرے پر ڈالی۔ تو وہ کانپ گیا۔ اس سے یہ فعل اضطرار اور دیوانگی میں سرزد ہوگیا تھا۔ اس کے دل میں جوآنا کے لیے محبت کا ایک زبردست سمندر امنڈ آیا۔

یکایک تلوار پھر اندھیرے میں چمکی۔ بادشاہ نے اسے اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔ اور تڑپ کر ملکہ کی لاش پر آ گرا۔

صبح لوگوں نے دیکھا کہ ڈنمارک کے بادشاہ لوئیس کی لاش ملکہ کی لاش سے لپٹی ہوئی ہے۔ اور اس کے ہونٹوں پر ہلکا ہلکا تبسم نمودار ہے۔

گلشنِ یونان کی نازک کلی

(۱)

ہیلن یونان کی حسین تریں دوشیزہ تھی۔ جب وہ باغ میں ایک خاص دلکش ادا کے ساتھ چلتی تو اس کے قدموں سے پھول جھڑتے۔ جب وہ اپنی ستاروں کی سی نگاہوں میں غرور کی چمک لئے ہوئے کسی سے مخاطب ہوتی۔ تو رعبِ حسن سے وہ گھبرا سا جاتا!۔۔۔۔ اس کے مخملیں گالوں کی سرخی گلاب کے پھول کو شرماتی تھی۔ اس کی پیشانی پرستان کے کسی سفید پھول کی سی تھی۔ اس کے کومل کومل ہاتھوں کی نرم و نازک انگلیاں کنول کے پھول کی لمبی لمبی پنکھڑیوں کی ہمشکل تھیں۔ اور ہونٹ اس قدر سرخ کہ ان پر انار کی دو باریک کلیوں کا گمان ہوتا۔ اس کا سینہ پہاڑ کی برف کی طرح سفید اور روئی کے گالوں کی طرح نرم و نازک تھا۔ اور اس کے گدرائے ہوئے خوبصورت بازو دو عریاں تلواروں کی طرح تھے۔ گویا کسی کی گردن میں حمائل ہوتے ہی اسے موت کی نیند سلا دیں گے۔ اس کے باریک چست لباس سے اس کا خوبصورت جسم صاف صاف نظر آتا تھا دیکھنے والوں کو یوں معلوم ہوتا۔ جیسے ابھی ابھی نور میں نہا کر آئی ہے۔ اور اس کے جسم سے سفید حسن کی شعاعیں نکل رہی ہیں۔

جب وہ سہیلیوں کے ساتھ چہلیں کرتی ہوئی باغ میں آتی۔ تو یوں معلوم ہوتا۔ جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چودھویں کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا ہے۔

اس کے پھوپھی زاد بھائی نے جو محبہ سازی کا فن سیکھ کر کوئی دس سال کے بعد ایک دور دراز ملک سے واپس آیا تھا۔ اسے باغ میں دیکھ لیا۔ دونوا ایک دوسرے

سے نا آشنا تھے۔ جب اس نوجوان نے حسن و شباب کی اس مورت کو باغ میں اپنی سہیلیوں سے شوخیاں کرتے دیکھا۔ تو مبہوت سا رہ گیا۔ وہ ایک بیباک سا نوجوان تھا۔ ہیلن کی نگاہوں سے نگاہیں ملا کر کہنے لگا۔

"اے حسینہ! قسم ہے مجھ کو انتقام کی دیوی کی۔ کہ تو باغ کے تمام پھولوں سے زیادہ حسین اور شوخ ہے۔ جی چاہتا ہے۔ کہ تیرا منہ چوم لوں"!

ہیلن کی سہیلیاں نوجوان کی اس بیباکی پر حیرت سے اس کا منہ تکنے لگیں۔ کہ بھلا ایک جرنیل کی بیٹی۔ اور پھر خوبصورت بیٹی کب گوارا کر سکتی تھی۔ کہ ایک نوجوان اس بیباکی سے اس کے سامنے اظہار الفت کرے۔ اس نے نوجوان کے منہ پر ایک ایسا تھپڑ جمایا کہ اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ لیکن چند دن بعد جب اسے معلوم ہوا کہ یہ نوجوان اس کا پھوپھی زاد بھائی ہے۔ اور وہ دونوں ایک بار پھر اسی باغ میں ملے۔ تو ہیلن نے شرما کر سر جھکا لیا۔ اور کہنے لگی۔

"بھائی جان! مجھے معاف کر دیجئے!"

نوجوان جواب میں صرف یہ کہہ سکا۔ "ہیلن مجھے تم سے محبت ہے"۔

ہیلن نے جواب میں خوبصورت نوجوان کے چہرے پر ایک حیران نگاہ ڈالی۔ اور ایک سرد آہ بھر کر وہاں سے چلی گئی۔ شاید حسینہ کا دل برف سے بھی کہیں زیادہ سرد تھا۔ جس پر محبت کے جذبات کی گرمی کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔

———(۲)———

قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے۔ کہ وہی ہیلن جس کا کام یونان کے دلکش باغوں سرسبز وادیوں اور دلکشا مرغزاروں میں اپنی سہیلیوں کے ہمراہ دن بھر سیریں کرتے رہنا تھا۔ اور جو دن کا اکثر حصہ ندی میں اپنے مرمریں پاؤں لٹکائے کنارے پر بیٹھی شیریں گیت گاتے ہوئے بسر کیا کرتی تھی۔ آج اپنے باپ سیلوکس کے ہمراہ ہندوستان کے میدان کارزار میں داد شجاعت دے رہی تھی۔ یونانی زبردست جرنیل "ورشل" کو پہ پا کر کے ہندوستان پر

پر قبضہ جمانا چاہتے تھے۔ اور ادھر دوشل اور اس کی فوجیں ناموسِ وطن پر کٹ مرنا چاہتی تھیں۔

ہیلن ایک بہادر عورت تھی۔ وہ اس اجنبی ملک کے گھنے جنگلوں میں سیر کرنے سے نہ ڈرتی تھی۔ اکثر مردانہ لباس پہن کر گھوڑے پر سوار ہو جاتی۔ اور ہندوستان کے گھنے اور بھیانک جنگلوں میں اپنے پھوپھی زاد بھائی دارا کے بغیر ہی دور دور تک نکل جاتی۔ دارا اسے اکثر بے احتیاطی سے روکتا۔ لیکن وہ جواب میں نہایت شوخی سے کہتی "تم تو بڑے ڈرپوک ہو!"

دارا کی محبت اب عشق کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ جب ہیلن اور وہ کیمپ میں تنہا ہوتے۔ تو دارا ہیلن کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگتا۔ ہیلن شرما جاتی۔ اور ہنس کر نگاہیں نیچی کر لیتی۔ ہیلن کو محسوس ہوتا تھا۔ کہ اس کے پھوپھی زاد بھائی کی محبت اس کے دل میں گھر کر رہی ہے۔

شام کے سائے آہستہ آہستہ گہرے ہو رہے تھے۔ سورج دیوتا زرد رُو ہو کر شفق کے سمندر میں آہستہ آہستہ ڈوب رہا تھا۔ ہیلن اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتی، سرسراتی ہوا کو چیرتی۔ بندوق کی گولی کی سی سرعت کے ساتھ واپس آ رہی تھی۔ دیو قامت درخت جنبشِ ہوا میں آہستہ آہستہ جھوم رہے تھے۔ یکایک ہیلن کا سر چکرا گیا۔ سامنے کی جھاڑیوں سے ایک خوفناک شیر بھرتا ہوا نکل آیا۔ اور ایک دم اس کے گھوڑے پر حملہ آور ہوا۔ اس سے پہلے ہیلن کو کسی جنگلی درندے سے دوچار ہونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ گھبراہٹ میں تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

ہیلن کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب اس نے دیکھا کہ خونخوار شیر زمین پر تڑپ رہا ہے۔ اور ایک نہایت ہی وجیہہ و شکیل ہندوستانی نوجوان اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا ہے۔

ہیلن نے اپنے اوسان بجا کرتے ہوئے کہا "میرے ہندوستانی محسن تم کون ہو؟ میں عمر بھر تمہارا احسان نہ بھولوں گا۔" ہیلن اس وقت مردانہ لباس پہنے ہوئے تھی۔

بہادر ورشل جواب میں کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اُسے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ یونانی نوجوان دراصل ایک یونانی حسینہ ہے۔ وہ کہنے لگا "یونانی نوجوان تیری آواز عورتوں کی سی خوبصورت آواز ہے"

اس کے بعد خوبصورت ورشل نے اپنی نگاہیں ہیلن کی گھبرائی ہوئی نظروں سے ملائیں۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے پیغام محبت دے دیا

―――――― (۲۳) ――――――

دارا نے دیکھا کہ ہیلن جو پہلے اس قدر خوش رہتی تھی۔ اب تمام دن مغموم رہتی ہے۔ اس کی محبت بھری التجاؤں کا جواب خلافِ معمول سرد مہری سے دیتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ ہیلن کے نازک دل میں خوبصورت ہندوستانی نوجوان کی دلنشین نگاہیں پیوست ہو چکی تھیں۔ اس کی طرزِ نگاہ نے ہیلن کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ ہیلن کی آنکھوں میں ہر وقت ورشل کی من موہنی صورت کا تصور رہتا تھا۔ اس کی آنکھیں اسے ڈھونڈتی تھیں۔ اور دل بے قرار۔ رات کو اکثر وہ اپنے خیمے سے نکل جاتی۔ دارا بھی گھبرا کر اس کے ساتھ ہو جاتا۔ اور اس سے پوچھتا "تم اتنی بے قرار کیوں ہو؟ کس کو ڈھونڈتی ہو؟" ہیلن کوئی جواب نہ دیتی۔ ہاں کبھی کبھی دارا کے سوالات کے جواب میں اس کی خوبصورت آنکھوں سے موتیوں کے سے خوبصورت آنسو نکل آتے۔

شام کا وقت تھا۔ ہیلن اپنے فوجی خیمے سے نکل کر دریا کے کنارے پہنچی تھی۔ وہ محبوب کے تصور میں ہمہ تن غرق ہو گئی تھی کہ یکایک گھوڑوں کے ٹاپوں

کی آواز سے جنگل گونج اٹھا اور ہیلن کا سلسلۂ خیالات منقطع ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ یونانی جو کل ہندوستانی فوج پر حملہ کرنے کے لئے گئے تھے واپس آ رہے ہیں۔ ان کے ہمراہ بہت سے ہندوستانی قیدی بھی ہیں۔ چونکہ وہ خود ایک ہندوستانی پر عاشق ہو چکی تھی۔ اس لئے قدرتاً اسے ہندوستانیوں سے کچھ دلچسپی سی ہو گئی تھی۔ وہ ہندوستانی قیدیوں کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھی۔ فوج کے بڑے افسر نے جرنیل کی بیٹی کو جھک کر سلام کیا یکایک ہیلن چونک سی گئی۔ ان قیدیوں میں اس کا محبوب بھی تھا۔ اسے اپنے محبوب کو اس حالت میں دیکھ کر خوشی بھی ہوتی۔ اور غم بھی۔ خوشی اس لئے کہ اسے اس کا دیدار نصیب ہوا۔ اور غم اس لئے کہ کہیں اس کا غدی باپ اسے قتل نہ کرا دے۔ ورشل بھی اپنی محبوبہ سے نگاہیں چار کرتے ہی ٹھٹک سا گیا۔ ہیلن آہستہ آہستہ فوج کے ساتھ ہو لی۔

اب چاروں طرف تاریکی مسلط ہو چکی تھی۔ بعض لوگ سو گئے تھے۔ اور بعض سونے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ہیلن نے اپنے ہاتھ میں ایک شمع لی۔ اور اپنے "قیدی" کے خیمے میں جا داخل ہوئی۔ اس نے ورشل کے چہرے پر روشنی ڈالی۔ اور اسے پہچان کر کہنے لگی ——— "او بہادر قیدی! تو جس نے شیر کو ہلاک کر دیا تھا۔ انسانی پنجے میں کس طرح گرفتار ہو گیا؟"

ورشل نے جواب دیا۔ "پیاری حسینہ! تو میرے چہرے پر شمع کی روشنی کیوں ڈالتی ہے۔ تیرا خوبصورت چہرہ شمع سے کہیں زیادہ روشن ہے۔ جس نے میرا نہاں خانۂ دل بھی منور کر رکھا ہے۔ اس رات کی تاریکی کو دور کرنے کے لئے تو تیری شمع رُخِ زیبا ہی کافی ہے۔ میں کس طرح گرفتار ہوا۔ یہ تمہیں پھر بتاؤں گا۔ بہر حال اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں۔ اور اس گرفتاری پر مجھے ناز ہے۔ اگر آج دشمن مجھے گرفتار نہ کرتا۔ تو میں ایک بار پھر تمہارے خوبصورت چہرے کا دیدار

کیسے کرتا۔"

باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ہیلن چونک گئی۔ کہنے لگی: "دیکھو یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں۔ لیکن ایک بات مجھے تم سے ضرور کہنا ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ بہادر قیدی تمہارا نام کیا ہے؟"

ورشل نے جواب دیا: "مجھے ورشل کہتے ہیں۔"

"اور تمہارا نام؟" ورشل نے پوچھا۔

دوشیزہ شرما کر بولی: "میرا نام ہیلن ہے۔"

ورشل نے ہیلن کا مرمریں ہاتھ زور سے اپنے ہاتھ میں دبایا۔ اور پھر اُسے اپنے ہونٹوں کے قریب لے گیا۔ یہاں تک کہ اس کے ہونٹ ایک نازک سے سفید ہاتھ پر ایک لمحے کے لیے جم کر رہ گئے۔ ہیلن شرما گئی۔ اس نے اپنا ہاتھ ورشل کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور باہر تاریکی میں غائب ہو گئی۔

قیدی رات کو پراسرار طریقے پر غائب ہو چکا تھا۔ لیکن جاتی دفعہ ہیلن سے عملی محبت کا ثبوت دے کر اُسے بے تابی کی آگ لگا گیا تھا۔ وہ تمام رات نہ سو سکی۔ کئی دفعہ اس نے اپنے نازک سے ہاتھ کو چوما۔ جسے اس کا محبوب اپنے خوبصورت ہونٹوں سے چوم چکا تھا۔ دو ہفتے گزر گئے۔ لیکن قیدی کی صورت دکھائی نہ دی۔

یونانی فوج کے متعلق بہت تشویشناک خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ چاروں طرف ورشل کے نام کا سکہ بیٹھ گیا تھا۔ یہ بہادر جرنیل کئی دفعہ یونانی سپاہ کے دانت کھٹے کر چکا تھا۔ سکندر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔

اب اس کی افواج دریائے چناب کو عبور کر رہی تھیں۔ یکایک مطلع ابرآلود ہو گیا۔ آسمان تاریک ہو گیا۔ اور بادل نے ہیبت ناک آواز میں گرج گرج کر ایک

مہیب سماں باندھ دیا۔ تھوڑی دیر میں آندھی چلنے لگی۔ اور اس زور سے چلی کہ کئی درخت اکھڑ گئے۔ یونانی فوج کی کشتیاں اس وقت دریا کے عین درمیان تھیں تیرتے ہوئے راج ہنسوں کی طرح ڈبکیاں لگانے لگیں۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ خوفناک سماں دیکھنے میں آیا۔ جس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

چاروں طرف سے چیخوں اور آہ و بکا کی آوازیں آرہی تھیں۔ المدد۔ المدد!! کی دلدوز صداؤں نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی۔ ایک ہندوستانی جو ساحل پر کھڑا اس منظر سے "لطف اندوز" ہو رہا تھا۔ کہ کس طرح دشمن کی فوج غرق ہو رہی ہے یکایک اس نوجوان کے کانوں سے ٹکراتی ہوئی ایک ایسی شیریں آواز سنی۔ جو بربطِ ناہید کے نغموں سے زیادہ خوبصورت اور دلکش تھی۔ اور جسے وہ ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتا تھا۔ جیسے عام چھوٹے چھوٹے بے نور ستاروں میں سے مشتری کو ڈھونڈ لینا بہت آسان ہے۔

نوجوان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایک لمحے میں وہ دریا میں تھا۔ اس نے اپنی شوخ ادا محبوبہ کو پہچان لیا۔ اور جان ہتھیلی پر رکھ کر اسے کنارے پر لانے میں کامیاب ہو گیا۔

چند منٹ کے بعد جب وہ ہوش میں آئی۔ تو ورشل سے لپٹ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "پیارے ورشل!"

ورشل نے اسے آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اس کے خوبصورت ہونٹوں پر بے تحاشا بوسوں کی بارش کر دی۔ اس طرح کہ اس نازک اندام حسینہ کا دم گھٹنے لگا۔ جب وہ ورشل کے مضبوط بازوؤں کی قید سے رہا ہوئی۔ تو دور کر پرے ایک پتھر پر جا بیٹھی۔

ورشل دریا کے کنارے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھا تھا۔ ہیلن شرماتی ہوئی

پھر اس کے پاس آئی - اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یکایک اس کا خوبصورت سر ورشل کے ہونٹوں پر جھکتا گیا۔ ہیلن کے خوبصورت ہونٹ - ورشل کے ہونٹوں سے پیوست ہو چکے تھے۔ کوئی دم کے لئے عاشق اور محبوبہ کی زندگی نشہ میں ڈوب کر رہ گئی ——— ہیلن نے پہلی بار اس شدت سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔

ورشل اور سکندر کی فوجوں کے درمیان ایک خونریز جنگ ہوئی۔ سلوکس کے ہاں جرنیل ورشل نے یونانی فوجوں کے چھکے چھڑا دیئے - میدانِ جنگ لالہ زار بن گیا لیکن یونانی جو وطن سے ہزاروں کوس دور تھے۔ جن کے دلوں میں اب زندہ سلامت وطن پہنچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تھی - اور جواب بچ کر واپس بھی نہیں جا سکتے تھے۔ یکایک ایک بار پھر ہندوستانی سپاہ پر ٹوٹ پڑے - ہندوستانی فوج پسپا ہو گئی ——— ورشل گرفتار کر لیا گیا - اور سکندر نے اس کے قتل کا حکم دے دیا۔

رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی - چودھویں کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی - ہر طرف کائنات پر ایک سکوت طاری تھا ہیلن قیدی کے کمرے میں داخل ہوئی - اور آتے ہی دوڑ کر اس سے چمٹ گئی - اسکی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

ورشل کہنے لگا "روتی کیوں ہو - میں موت سے خوف نہیں کھاتا"

ہیلن کہنے لگی - "پیارے ورشل! میرا دل کہہ رہا ہے - کہ تمہیں سزائے موت نہیں دی جائے گی - البتہ میں جس بات سے غمگین ہوں - وہ یہ ہے - کہ میں اپنے باپ کے ساتھ یونان جا رہی ہوں - میرا بوڑھا باپ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

صبح تک ہیلن ورشل کی آغوش میں رہی - سپیدۂ سحر نمودار ہوتے ہی وہ

دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

(۴)

واقعات نے ایسا پلٹا کھایا۔ کہ سکندر پنجاب اور کابل کی سلطنت اپنے جرنیل سلوکس کے حوالے کر کے ہندوستان سے واپس چلا گیا۔ ہیلن اب خوش تھی۔ کہ وہ یونان نہیں جا رہی۔ لیکن ورشل اب پھر غائب ہو چکا تھا۔ کئی ماہ گزر گئے لیکن ورشل کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بہادر جرنیل ورشل چندر گپت کا لقب اختیار کر کے اب پاٹلی پتر کے تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ ہیلن کے باپ نے زبردستی ہیلن کی شادی چندر گپت سے کر دی۔ چندر گپت بھی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر انکار نہ کر سکا۔ نہ تو ہیلن کو خبر تھی۔ کہ وہ اپنے محبوب سے بیاہی جا رہی ہے۔ نہ عاشق کو اس بات کا علم تھا کہ۔ اس کی دلہن ہیلن ہے۔

وصال کی پہلی شب تھی۔ ہندوستان کا زبردست شہنشاہ چندر گپت اپنے شبستان میں جلوہ افروز تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ہیلن کا تصور اس کے دل میں چٹکیاں لے رہا تھا۔ دلہن غم کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ شہنشاہ نے نہایت مردہ دلی سے اپنی دلہن کا جھکا ہوا غمگین سر اوپر اٹھایا۔ اس کے منہ سے مسرت انگیز چیخ نکل گئی۔ ہیلن نے جب اپنی نگاہیں محبوب سے ملائیں۔ تو پیارے ورشل کہکر اس سے چمٹ گئی۔ چندر گپت نے ہیلن کو اپنی آغوش میں بھینچ لیا۔ اور اس کی آغوش تنگ ہوتی گئی ——— !

عرب شاعرہ کا رومان

(۱)

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چاند اپنی پوری تابانیوں سے نیلگوں فلک پر جلوہ فگن تھا۔ اور صحرا میں کھجوروں کے جھنڈ کے پیچھے بنو عارث کے خیمے اور کچے مکان چاندنی میں دُور سے ایسے نظر آرہے تھے۔ گویا چھوٹے چھوٹے ٹیلے ہوں۔ کبھی کبھی ان خیموں سے کسی گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز آجاتی تھی۔ جو رات کے اس پراسرار سکوت کو چند لمحوں کے لئے توڑ دیتی۔ اور اس کے بعد پھر وہی سکوت صحرا اور اس کی ہر چیز پر چھا جاتا۔ دور تک پھیلی ہوتی ریت کے درمیان کہیں کہیں نخلستان کے کھجوروں کے جھنڈ کھڑے تھے۔ جن پر کبھی کبھی کوئی صحرائی اُلّو یا چمگادڑ اپنی وحشت خیز چیخوں سمیت آکر بیٹھ جاتی۔ بنو عارث پر ایک گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ اور تمام کا تمام قبیلہ میٹھی نیند کے مزے لے رہا تھا صحرا کی سمت سے آنے والے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے جو کھجوروں کے پیڑوں کے شانوں کو ہلا کر قبیلہ بنو عارث کے مکانوں اور خیموں کے اوپر سے گزر رہے تھے۔ جاتے جاتے سونے والوں کو تھپکیاں دے جاتے۔ دور سے بغور دیکھنے پر ایک آدھ خیمے میں روشنی کی ایک جھلک بھی دکھائی دے جاتی۔

اس خیمے میں جو کھجوروں کے جھنڈ کے بالکل قریب تھا۔ اور جس کے باہر دو اونٹ بندھے ہوئے تھے۔ دو عورتیں اونٹوں کے بالوں کے بنے ہوئے گدیلوں پر آرام کی نیند سو رہی تھیں۔ اس خیمے میں ان کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ بغور دیکھنے پر دونوں عورتیں

معلوم نہ ہوتی تھیں۔ بلکہ دو نہایت خوبصورت نوعمر لڑکیاں تھیں۔ جن کے سفید رخساروں کی آب و تاب سے خیمے کی تاریکی بہت حد تک کم ہو گئی تھی۔ اور ان کے جگمگاتے ہوئے چہرے تاریکی میں ایسے معلوم ہوتے تھے۔ گویا چاہِ ظلمات میں دو حسین چاند غرق ہیں۔ اور یہ حقیقت ان کے ہیجان آفریں شباب سے ہی ظاہر ہو رہی تھی۔ جو ان کے جسموں سے پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کا لباس نہایت رنگین اور جاذب نظر تھا۔ اور ان کے ابھرے ہوئے نوخیز سینوں پر۔ جو سانس کی آمد و رفت سے ایک لطیف تموج پیدا کر رہے تھے۔ سنہری پھول کاڑھے ہوئے تھے۔ جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس قبیلے کے کسی ممتاز فرد کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔ پاس کے کھجوروں کے جھنڈ پر سے ایک صحرائی چمگادڑ کی خوفناک چیخ کی آواز آئی۔ اور وہ اپنے بھاری پروں سے ایک شور پیدا کرتی ہوئی صحرا کی جانب اڑ گئی۔ اسی وقت دور سے ایک گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جو صحرا کے شمال کی طرف سے آ رہا تھا۔ چمگادڑ کی خوفناک چیخ سن کر بڑی لڑکی جس کا نام بازغہ تھا۔ سوتے سوتے ڈر گئی۔ اور پھر یکایک اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ تھیں۔ اور ان میں ایک ایسی چمک تھی۔ جس کی تاب بہت کم نوجوان لا سکتے ہیں۔ اس نے آہستہ سے اپنے ساتھ والی لڑکی کو ہلایا۔ اور پھر اپنی سریلی آواز میں کہا "جیدہ! کیا تم نہیں اٹھو گی؟"

جیدہ نے تھوڑی دیر کے بعد اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اور پھر آہستہ سے بولی "کیوں بازغہ؟ تم جاگ کیوں رہی ہو؟"

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز اب اور زیادہ قریب آ گئی تھی۔ اور پھر یکایک ایک سفید رنگ کا گھوڑا جس پر ایک سوار سرخ لبادہ اوڑھے بیٹھا تھا۔ کھجوروں کے جھنڈ کے قریب آتا دکھائی دیا۔ اور پھر دوسرے لمحہ میں وہ گھوڑا وہیں رک گیا۔ اور اس کا

سوار آہستہ سے جست لگا کر زمین پر کود پڑا۔ اس نے گھوڑے کو وہیں چھوڑ دیا۔ اور خود دبے پاؤں اس خیمے کی جانب بڑھنے لگا۔ جس میں وہ دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں۔

ایک سایہ اس خیمے کے قریب آتا دکھائی دے رہا تھا۔

(۳)

بازعہ قبیلۂ عارف کے سردار شیخ عادل کی اکلوتی لڑکی تھی۔ چونکہ شیخ عادل کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس لئے وہ اپنی لڑکی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اور اس کے ہر طرح کے آرام و آسائش کا خیال رکھتا تھا۔ بازعہ جس طرح حسن و جمال میں بے نظیر تھی اُسی طرح دماغی قابلیتوں میں بھی اپنا کوئی ثانی نہ رکھتی تھی۔ وہ نہایت ذہین، بلا کی تیز فہم اور حاضر جواب تھی۔ اور شاعری میں تو اس کا دور و نزدیک کوئی جواب نہ تھا۔ وہ شعر کہتی تھی۔ اور ایسے شعر کہتی تھی۔ جو اس کی زبان سے نکلتے ہی صحرا کے تمام قبائل کے شعر پسند افراد کی زبانوں پر رواں ہو جاتے تھے۔ اس کی زبان نہایت فصیح و بلیغ تھی۔ اور اس کی شاعری، نادر تشبیہات، اچھوتے استعاروں اور محاکات کی وجہ سے بے مثال تھی۔ صحرا کے دیگر قبائل کے مختلف شعراء نے اس کی شاعری کے اسلوب کی نقل اتارنی چاہی۔ لیکن کوئی بھی شاعر اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا زور بیان، فصاحت اور بلاغت بالکل قدرتی تھیں۔ وہ فی البدیہہ شعر کہتی۔ جو موقع کی مناسبت سے اپنے اندر ایک خاص موزونیت لئے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ اس نے اپنے قبیلے کے سب سے زیادہ سبک رفتار گھوڑے کے متعلق حسب ذیل اشعار فی البدیہہ کہے جب کہ وہ گھوڑا دیگر تمام قبائل کے گھوڑوں کو ایک آزمائشی دوڑ میں پیچھے چھوڑ کر اس کے خیمے کے قریب کھڑا ہانپ رہا تھا۔ وہ اسی وقت اپنے خیمے سے باہر نکلی۔ اور گھوڑے کو تھپکی دے کر کہنے لگی۔

"تو گھوڑا نہیں۔ بلکہ گھوڑے کی شکل میں آسمانی بجلی ہے۔ کہ جب وہ کوندتی ہے تو نگاہیں اس کا تعاقب نہیں کر سکتیں۔"

"تو اس قدر سبک رفتار ہے۔ کہ اگر تو وقت کے ساتھ کبھی دوڑے۔ تو مجھے یقین ہے کہ وقت کو بھی اپنے پیچھے چھوڑ جائے۔"

"جب تو دوڑتا ہے۔ تو ہوا تھم جاتی ہے۔ اور خورشید اپنی رفتار ہلکی کر لیتا ہے زمین و آسمان کے درمیان کوئی شے تجھ جیسی سُبک رفتار نہیں۔"

"تو ہمارے قبیلے کی ناک ہے۔ اور خدا کرے تو بڑھاپے میں بھی اتنا ہی برق رفتار رہے جتنا کہ اب ہے۔"

اس کے باپ شیخ عادل نے جب یہ اشعار سنے تو وہ اس قدر خوش ہوا۔ کہ اس نے اپنی نورِ نظر کو سینے سے لپٹا لیا۔ اور اس کے ماتھے پر پدرانہ شفقت کی ایک مہر ثبت کر دی۔ گھوڑے پر کہے ہوئے مندرجہ بالا اشعار جلد ہی تمام قبائل میں مشہور ہو گئے۔ اور ہر کوئی شہسوار اپنے گھوڑے کی تعریف میں گنگناتا۔

کئی دفعہ اس کے قبیلے کی صحرائے عرب کے دیگر جنگجو قبائل سے جنگ ٹھن جاتی تھی۔ تو اس وقت ان کے قبیلے کا ہر فرد و بشر بازعہ کی لکھی ہوئی رجز پڑھتا۔ ایک دفعہ ایک معمولی سی بات پر اس قبیلے کی ایک دوسرے قبیلے کے ساتھ جو بنو حذر کے نام سے مشہور تھا۔ جنگ ہو گئی۔ یہ جنگ کئی مہینے جاری رہی۔ اور اس میں دونوں طرف سے کئی آدمی ہلاک ہو گئے۔ لیکن کوئی فریق بھی جنگ سے کنارہ کش ہونا پسند نہ کرتا تھا۔ قبیلہ بنو حذر ان کے قبیلے سے کسی قدر طاقتور تھا۔ اس لئے ابتداء میں اس قبیلے کے لوگوں نے خوب سرگرمی دکھائی۔ بلکہ ایک دو دفعہ تو قبیلہ بنو عارف کے لوگوں کے پاؤں میدانِ جنگ سے اکھڑ بھی گئے۔ لیکن آخر میں اسی قبیلے کو فتح نصیب ہوئی۔ اس کا راز کیا تھا؟

جب بازعہ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ کہ اس کے قبیلے کے لوگ شکست کھائیں گے۔ تو اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ مردانہ لباس پہنا۔ اور تلوار ہاتھ میں لے میدان کارزار میں جا پہنچی۔ اور وہاں جاتے ہی للکار للکار کر یہ اشعار فی البدیہہ پڑھنے لگی۔

"اے قبیلۂ بنو عارث کے بیٹو! اگر تم اپنے قبیلے کی آن برقرار رکھنا چاہتے ہو۔ جسے تمہارے بزرگوں کے خون نے قائم کیا ہے"

(تو) تم آج کے دن اپنی جانیں اپنی ہتھیلیوں پر رکھ لو۔ ایک ہاتھ میں بجلی کی سی چمک والی تلوار پکڑ لو۔ اور دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں اپنے پُر غرور سر جو کبھی کسی انسان کے آگے نہیں جھکے۔

اگر آج کے دن ہمارے قبیلے کے کسی آدمی نے میدانِ جنگ سے منہ موڑا۔ تو یاد رکھو کہ وہ ہمارے قبیلے کا فرد ہی نہیں۔ بلکہ غدار ہے۔ اُس (راہ فرار اختیار کرنے والے) نے اس قبیلے کی ماؤں کا دودھ ہی نہیں پیا"

اپنی تلواروں کو میانوں سے باہر نکال لو۔ نعرے لگاتے ہوئے گھوڑوں کو آگے بڑھاؤ۔ اور زمین کو دشمنوں کے خون سے حنا کے رنگ کی طرح بنا دو۔ اور اس طرح لڑو۔ کہ سورج تمہاری تلواروں کی خونفشانی کی تاب نہ لا کر اپنا منہ چھپا لے۔ اور دن ایک سیاہ چادر اوڑھ لے۔

ہاں ہاں۔ قبیلۂ بنو عارث کے بہادرو! جنگ کے میدان میں شیر بن جاؤ۔ اور اپنے نہ تھکنے والے بازوؤں سے خوب تلواریں چلاؤ"

یہ پُر جوش اشعار سن کر اور پھر وہ بھی عورت کی زبانی، قبیلہ بنو عارث کا کون ایسا فرد تھا۔ جو جنگ سے گریز کرے اور میدانِ جنگ میں کمزوری دکھائے۔ چنانچہ ان اشعار نے قبیلۂ بنو عارث کے لوگوں میں جو جنگ سے کافی بددل ہو چکے تھے۔ ایک نئی روح پھونک دی۔ اور انہوں نے اس زور سے حملہ کیا۔ جس کی شدت کا مخالف قبیلہ تاب نہ

لا سکا۔ اور اس کے پاؤں میدانِ جنگ سے اکھڑ گئے قبیلۂ بنو عذرہ ہار گیا۔ اور قبیلۂ بنو طارق کو فتح نصیب ہوئی۔ پھر کیا تھا۔ چاروں طرف قبائل میں نابغہ کی شاعری کی دھوم مچ گئی۔ اور مختلف قبائل کے لوگ اس کے مداح ہو گئے۔

قبیلۂ بنو عذرہ کا ایک نوجوان فرد جس کا نام منذر تھا۔ اپنے قبیلے کے تمام افراد سے ایک مختلف طبیعت کا مالک تھا۔ وہ فطرتاً جنگ و جدال سے نفرت کرتا تھا حالانکہ جنگ و جدال ان کے قبیلے کی گھٹی میں پڑے تھے۔ وہ خاموش طبیعت اور خلوت گزیں تھا۔ اس لئے اپنے قبیلے میں وہ ہر دلعزیز نہ تھا بلکہ لوگ اسے برا سمجھتے تھے۔ وہ اپنے باپ کے اونٹ صحرا میں چرایا کرتا تھا۔ اور جب اونٹ صحرا میں اِدھر اُدھر مختلف جڑی بوٹیاں تلاش کر کے کھایا کرتے۔ تو وہ نخلستان کے چشمے کے کنارے کسی کھجور کے درخت کے نیچے بیٹھ جاتا۔ اور نہایت سوز و گداز سے اشعار پڑھتا۔ اسے عرب کے تمام بڑے بڑے شاعروں کے اچھے اچھے قصائد اور اشعار یاد تھے۔ اور ان کے علاوہ وہ خود بھی نہایت اچھے شعر موزوں کر لیتا۔

ایک دن حسبِ معمول وہ صحرا میں اونٹ چرا رہا تھا۔ سورج کی تمازت بدن کو جھلسائے دیتی تھی۔ اور اس کی آتش افروز شعاعیں چرند و پرند اور حیوان وانسان سب کو اس امر پہ مجبور کر رہی تھیں۔ کہ وہ تمازتِ آفتاب سے بچنے کے لئے کوئی پناہ گاہ تلاش کریں۔ منذر آج اونٹ چراتا چراتا اپنے قبیلے کی حدود سے بہت آگے نکل گیا۔ اور اس نخلستان کو بھی بہت پیچھے چھوڑ گیا۔ جس کے چشمے کے کنارے وہ دوپہر کو بیٹھ کر اشعار گایا کرتا تھا۔ وہ ایک بے خودی کے عالم میں آہستہ آہستہ اشعار پڑھتا آگے کو چلتا ہی گیا۔ اور جب دوپہر کا سورج اپنی شعاعوں کے ذریعے سے صحرا کے ذرے ذرے پر آگ برسانے لگا۔ تو وہ چونک پڑا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ جانتا تھا قبیلہ بنو عذرہ کی حدود سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ اور اب اس کے

سامنے قبیلۂ بنو غارف کا نخلستان پھیلا ہوا تھا۔ اونٹ صحرا میں ادھر ادھر چر رہے تھے۔ اور چونکہ دوپہر کا وقت تھا ــــــــــــــ آفتاب نصف النہار پر آیا ہوا تھا۔ اس لئے منذر تمازت آفتاب سے بچنے کے لئے سامنے کے نخلستان کی طرف چلا گیا۔

نخلستان میں پہنچ کر اس نے چشمے میں ہاتھ منہ دھویا۔ اور پھر چشمے کا سرد پانی پینے لگا۔ چشمے کے قریب ہی ایک گڑھا تھا جس میں بارش اور چشمے کا ملا جلا پانی کھڑا تھا۔ اس گڑھے سے بنو غارف کے لوگ اپنے اونٹوں اور گھوڑوں کو پانی پلاتے اور ان کی عورتیں کپڑے دھوتیں اور نہایا کرتی تھیں۔ منذر پانی پی کر کھجوروں کی چھاؤں کے تلے بیٹھ گیا۔ اور دھیمے دھیمے سروں میں اپنے تازہ کہے ہوئے اشعار گانے لگا۔

"سرد ہوا کے جھونکے کھجور کے درختوں کا سایہ اور خوشگوار چشمے کی موجودگی کسی ملکۂ حسن کی یاد دلاتی ہے۔

آہ! وہ کون ہے جس کی یاد میں میرا دل پارے کی طرح بے قرار رہتا ہے۔

لیکن میں جس کو نہیں جانتا۔

اگر وہ اس وقت اس جگہ آجائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ کیونکہ میرے علاوہ سرد ہوا کے جھونکے کھجور کے درختوں کا سایہ اور خوشگوار چشمہ بھی اس کا قرب چاہتا ہے ...."

ابھی وہ یہ شعر گنگنا ہی رہا تھا کہ اس کے کانوں میں دور سے نسوانی قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اور ساتھ کے ساتھ ہی ہنسی مذاق کی باتوں کی آواز بھی آنے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو شوخ و شنگ دوشیزائیں الہڑپن کے جوش میں ایک دوسری سے چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں۔ ان دلکش آوازوں کو سن کر منذر جیسے شاعر کا دل بلیوں

اچھلنے لگا۔ اور اسے ایسا معلوم ہونے لگا۔ کہ ابھی ابھی وہ جن اشعار کو پڑھ رہا تھا۔ اب ان کی عملی شرح اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔

نقرئی قہقہوں اور رسیلی بالوں کی آوازیں اب اور زیادہ قریب ہو گئی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ کیونکہ اسے معلوم ہو گیا۔ کہ آنے والیاں قبیلہ بنو عارف سے تعلق رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ فوراً کھجور کے درختوں کی آڑ میں چھپ گیا۔ تاکہ وہ ان کو اچھی طرح سے دیکھ سکے۔ اور ان کی حرکات و سکنات کا خوب اچھی طرح مطالعہ کر سکے۔

دوسری جانب کے درختوں کے جھنڈ سے دو نوعمر لڑکیاں جن کی عمریں سولہ یا سترہ برس کی ہونگی۔ نمودار ہوئیں۔ وہ اس قدر حسین تھیں۔ کہ منندہ نے آج تک ان جیسی حسین لڑکیاں کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ان کا رنگ کنول کے پھولوں کے مانند سفید آنکھیں آسمان کے ستاروں کی طرح چمکیلی اور بال رات کی طرح سیاہ تھے۔ انہوں نے چشمے کے قریب آ کر ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ اور چشمے کے کنارے بیٹھ گئیں۔ یہ دونوں قبیلہ بنو عارف کے سردار شیخ عادل کے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ایک شیخ عادل کی شاعرہ لڑکی بازغہ تھی۔ جو دوسری سے کسی قدر حسین زیادہ تھی۔ اور جس کی آنکھیں سیاہ تھیں۔ اور دوسری اس کی عم زاد بہن جیدہ۔ یہ دونوں آپس میں بڑی گہری سہیلیاں تھیں۔ اور ایک دوسری سے انتہائی محبت رکھتی تھیں۔ دونوں ابھی غیر شادی شدہ تھیں اور اگرچہ مختلف قبائل کے سرداروں کے لڑکے ان سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن شیخ عادل خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی شادی کرنے پر رضا مند نہ تھا۔

وہ دونوں چشمے کے کنارے بیٹھ کر مختلف قسم کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر یکایک جیدہ نے بازغہ کو کہنی مار کر کہا۔ کیا ہم ذرا چشمے میں نہا نہ لیں۔ گرمی سے جی بہت گھبرا رہا ہے

اس وقت اتفاق سے یہاں کوئی شخص ہے بھی نہیں۔"

بازغہ نے جواب دیا۔ " جیدہ! میرا بھی یہی جی چاہتا ہے۔ کہ کچھ دیر نہالیں۔"

یہ کہہ کر انہوں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ اور پھر یہ اطمینان کر کے کہ آس پاس کوئی نہیں۔ انہوں نے اپنے کپڑے اتارنے شروع کئے۔ پہلے انہوں نے اپنی چادریں زمین پر اتار کر رکھ دیں۔ پھر نہایت احتیاط سے اپنا لباس اتارنے لگیں۔ منذر یہ سب ہوش ربا نظارہ کھجور کے درختوں کی آڑ میں چھپا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جب وہ اپنے لباس اتارنے میں مشغول تھیں۔ تو اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل یکبارگی ڈوب گیا ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے دو نہایت نفیس مجسمہ ہائے رعنائی نیم عریاں حالت میں کھڑے تھے۔ ان کے سڈول جسم اور گدراتے ہوئے سینے جو دودھ کی طرح سفید تھے۔ اس کے دل میں ہیجان کا ایک ایسا طوفان پیدا کرنے لگے۔ جس کی اذیت لحظہ بہ لحظہ اور زیادہ ہونے لگی۔ آخرکار جب وہ بالکل عریاں ہو کر ایک لمحہ کے لئے چشمے کے کنارے کھڑی تھیں۔ اور پانی میں اترنے کے لئے بالکل تیار تھیں۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کا سارا جسم ایک شعلے میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اگر چند سے یہی حالت رہی۔ تو اس کا جسم جل بھن کر راکھ کا ڈھیر ہو جائے گا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کے سامنے دو حسین مجسمے کھڑے ہیں۔ جن کے سینے فردوس کے دو حسین پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں۔ فضا میں ان کے برق وش حسن سے چمک اٹھی ہیں۔ اور ان کے جسموں کی کیف آفریں عریانی چشمے کے پانی میں بھی لذت و سرور کے ہلکے ہلکے مدوجزر پیدا کر رہی ہے۔ لیکن یہ منظر زیادہ دیر تک اس کی نگاہوں کے سامنے نہ رہا۔ ایک دو لمحے تک وہ چشمے کے کنارے اپنی پوری عریانیوں سمیت کھڑی رہیں۔ پھر یکلخت چشمے کے پانی میں کود پڑیں۔ پانی میں ان کے کودنے سے ہل چل پیدا ہوئی۔ اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اس کے بعد وہ کافی دیر تک چشمے میں نہاتی رہیں۔ منذر اپنی جگہ پر چپ چاپ

ساکت وصامت یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد خدا جانے اس کے جی میں کیا خیال آیا کہ وہ یکایک اپنی جگہ سے آہستہ سے اٹھا۔ اور دبے پاؤں اس جھاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ جہاں ان لڑکیوں کے کپڑے پڑے تھے۔ اس وقت وہ دونوں نہاتی ہوئی چشمے کے دوسری طرف چلی گئی تھیں۔ جو کھجور کے جھنڈ کے پیچھے تھا۔ منذر نے جھاڑی کے قریب آکر ان کے کپڑے اٹھا لیے۔ اور پھر اسی طرح دبے پاؤں اپنی جگہ پر چلا گیا۔ اور ان کا تماشہ دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں اچھی طرح سے نہا دھو کر چشمے سے باہر نکلیں۔ اور اپنا لباس پہننے کے لئے اس جھاڑی کے قریب آئیں۔ جہاں انہوں نے اپنے کپڑے رکھے تھے۔ مگر یہ دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ ان کے کپڑے اپنی جگہ پر نہیں ہیں۔ انہوں نے اس جھاڑی کے ادھر ادھر خوب اچھی طرح تلاش کیا۔ لیکن وہاں ہوتے۔ تو ان کو ملتے۔ آخر کافی دیر تک تلاش کرنے کے باوجود بھی جب ان کو اپنا لباس نہ ملا۔ تو ان کے چہرے خوف سے زرد ہو گئے۔ اور عجیب پریشانی کے عالم میں وہاں ایک مایوسی اور بیچارگی کی حالت میں بیٹھ گئیں۔ منذر ان کی پریشانی کو بڑے مزے سے دیکھ رہا تھا۔ اور ان کی بیچارگی کی حالت سے خوب حظ اٹھا رہا تھا۔ آخر وہ نہ رہ سکا۔ اور بلند آواز سے یہ شعر پڑھنے لگا۔

"میں نے دو حسین لڑکیوں کو اتنا پریشان کیا ہے۔ ڈر ہے کہ وہ غم اور پریشانی کی حالت میں کہیں خودکشی نہ کر لیں"

"مگر نہیں اے حسین لڑکیو! تمہاری پریشانی تو اب ختم ہو جائے گی۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ اب میری پریشانی کون دور کرے گا؟

جو اب معلوم ہوتا ہے کہ تمام عمر میرا پیچھا نہ چھوڑے گی"

جب لڑکیوں نے منذر کی آواز سنی۔ تو گھبرا گئیں۔ اور کپڑے گم ہونے سے جو

پریشانی ان کو ہوتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ سراسیمہ ہو گئیں۔ اور فرط حیرت سے ادھر دیکھنے لگیں۔ جہاں سے منذر کی آواز آرہی تھی۔ ان کے چہرے فوراً ہی شرم و حیا کے فطری جذبے سے گلنار ہو گئے۔ اور یہ جان کر کہ یہ آواز کسی مرد کی ہے۔ اپنے عریاں جسموں کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ جیدہ حیران تھی کہ اب کیا کیا جائے۔ کیونکہ انہیں زندگی بھر کبھی ایسا عجیب و غریب اتفاق نہ ہوا تھا۔ لیکن باذعہ جو بلا کی ذہین اور فی البدیہہ شعر کہنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھی۔ فوراً ہی یہ شعر موزوں کر کے پڑھنے لگی۔

"تو کون ہے اے اجنبی اور کس قبیلے سے تیرا تعلق ہے؟ اور تو نے کہاں سے یہ جرأت سیکھی۔ کہ بن بیاہی لڑکیوں کے کپڑے چھپا لے؟ معلوم ہوتا ہے کہ تو حسن کا چور ہے۔ لیکن بزدل۔"

جب منذر نے ایک دوشیزہ کی زبان سے یہ فصیح و بلیغ اشعار فی البدیہہ سنے۔ تو وہ تڑپ گیا۔ اور اس نے ان سے کہا۔ کہ وہ اپنے کپڑے آکر اس سے لے جائیں۔ چنانچہ مجبوراً ان کو منذر کے سامنے اس حالت میں جانا پڑا۔ جب انہوں نے کپڑے پہن لئے۔ تو منذر نے ان سے درخواست کی۔ کہ وہ اس کے پاس کچھ دیر کے لئے ٹھہر جائیں تاکہ وہ ان سے باتیں کرے۔ باذعہ اجنبی کی یہ دلیری دیکھ کر بہت متاثر ہو رہی تھی۔ اور چونکہ ایسی باتوں میں وہ خود بڑی بے باک تھی۔ اس لئے اس نے دل ہی دل میں اجنبی کی اس حرکت کو بہت پسند کیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ منذر کی وجیہہ صورت اور دلکش انداز پر فریفتہ ہو چکی تھی۔ ادھر منذر بھی اس کے حسن کی شراب کی کیف آفرینیوں سے مدہوش ہو رہا تھا۔ چنانچہ دونوں ایک لمحہ تک بالکل ساکت و جامد کھڑے رہے۔ آخر جیدہ نے مہر سکوت کو توڑا۔ اور منذر سے پوچھا۔ کہ وہ کون ہے۔ اور کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے؟ منذر نے اپنا حسب و نسب بلا کم و کاست ان کو بتا دیا۔ لیکن جب

ان کو یہ پتہ چلا کہ یہ جوان ان کے دشمن قبیلے سے تعلق رکھتا ہے تو ان کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن منذر نے ان کو بتایا کہ اسے ان کے قبیلے سے کسی قسم کی پرخاش نہیں۔ اور وہ فطری طور پر لڑائی جھگڑوں سے گریز کرتا ہے۔ اور اپنے قبیلے کے لوگوں کی ان باتوں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

پھر وہ کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اور ایک دوسرے کو اپنے اشعار سناتے رہے۔ آخر انہوں نے ایک دوسرے سے وعدہ کر لیا۔ کہ وہ کبھی کبھی ضرور ایک دوسرے سے ملا کریں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے رخصت ہوئے لیکن قرار کسے تھا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہوئیں۔ منذر برابر انہیں دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئیں۔ تو نہایت بے قراری کے عالم میں یہ اشعار بڑے سوز و گداز سے گانے لگا۔

"وہ کون تھی۔ اور کہاں سے آئی تھی؟ یہ مجھے معلوم نہیں۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب وہ یہاں سے گئی۔ تو میرے پہلو میں دل نہ تھا۔ وہ اس پھول کی طرح تھی جو صحرا میں سبز گیاہوں سے پوشیدہ اُگ رہا ہو۔ اور اس ستارے کی طرح تھی جو آسمان میں چمک رہا ہو"

یہ اشعار سوز و گداز کے عالم میں گاتا ہوا اپنے قبیلے کی طرف چلا۔ اس کے بعد منذر اور بازغہ دونوں چھپ چھپ کر اسی طرح درختوں کے جھنڈ میں اکثر ایک دوسرے سے ملا کرتے۔ اور ایک دوسرے کے فراق میں جو اشعار کہتے وہ ایک دوسرے کو سناتے۔ ان کی ان ملاقاتوں کی راز دار صرف بازغہ کی عم زاد بہن جمیدہ تھی۔ اسے ہی بازغہ اور منذر کے عشق کا حال معلوم تھا۔ اور اسے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا کیونکہ بازغہ اسے جان سے پیاری تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جس سے بازغہ کو محبت تھی جمیدہ کو اس سے کبھی نفرت نہ ہو سکتی تھی۔

ایک دن باتوں باتوں میں بازغہ نے منذر سے کہا۔ کیا ہی اچھا ہو۔ کہ وہ کبھی رات کو اس کے پاس آئے جس خیمے میں وہ سوتی ہے۔ اس میں سوائے بازغہ کے اور کوئی شخص نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر وہ کبھی رات کو اس کے خیمے میں آ جائے۔ تو بڑا لطف رہے گا۔ اور دونوں مزے سے شراب وصل سے شاد کام ہوں گے۔ چنانچہ منذر نے وعدہ کر لیا۔ کہ وہ آج ہی رات اس کے خیمے میں آئے گا۔
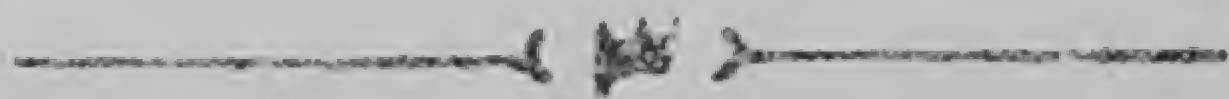
وہ سایہ اب اس کے دروازے پر آ پہنچا تھا۔ جس میں پہلے جمیدہ اور بازغہ سو رہی تھیں۔ لیکن اب دونوں جاگ رہی تھیں۔ جمیدہ نے پوچھا "تمہیں آج نیند کیوں نہیں آ رہی بازغہ؟"

بازغہ نے اپنا منہ اس کے کان کے قریب لے جا کر آہستہ سے کہا "تمہیں بتا دوں —— آج رات منذر نے آنے کا وعدہ کیا تھا؟"

جمیدہ نے فوراً ہی یہ جواب دیا "لیکن یہ بات بڑی خطرناک ہے؟ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو پھر؟"

بازغہ نے جواب دیا "آدھی رات کے قریب کسی کو کیا پتہ چل سکتا ہے!"

اس کے بعد دونوں آہستہ آہستہ منذر کی باتیں کرنے لگیں۔ منذر اب ان کے خیمے کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اور ارادہ کر رہا تھا۔ کہ کسی طرح خیمے کے اندر داخل ہو۔ جب اس نے بازغہ اور جمیدہ کے آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آواز سنی۔ تو اس نے طے شدہ فیصلے کے مطابق دروازے پر تین دفعہ ہلکی ہلکی تھپکی دی۔ بازغہ یہ آواز سن کر اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کے باہر آئی۔ اور منذر کو وعدہ کے مطابق آیا ہوا دیکھ کر بڑی خوش ہوئی اسے خیمے کے اندر لے آئی۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ جس کی لطافت اور رنگینی بیان نہیں ہو سکتی۔ منذر آہستہ سے بازغہ کے گدیلے پر بیٹھ گیا۔

بازغہ اس کے قریب بیٹھی تھی۔ دونوں کے درمیان ہجر و وصال اور بے مہری چرخ نیلوفری کے متعلق باتیں ہو رہی تھیں۔ منذر اور بازغہ دونوں کی حالت اس وقت اس شخص کے مانند تھی۔ جو شراب وصل کے جام بھر بھر کے پی چکا ہو۔ اور اب آخری دفعہ اپنا جام کبالب بھرنا چاہتا ہو۔ شراب محبت کا جام لبریز ہونے والا تھا۔ اور کسے معلوم تھا۔ کہ صرف آج کی رات یہ جام چھلکے گا۔ اور اس کے بعد انہیں کبھی اس شراب وصل کے ساغر نصیب نہ ہوں گے۔

منذر نے بازغہ کو اپنے دونوں بازوؤں میں بھینچ لیا۔ اور اپنے سینے سے لپٹا لیا اس کے لب لعلیں اور پھولی سے رخساروں کے پے در پے بوسے لینے لگا۔ اسے اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ دنیا و مافیہا میں سوائے اس کی ذات کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ بازغہ جیسی حسن کی ملکہ کے بوسے دیگر عورتوں کے باغہائے حسن کی گلچینی کرنے کے مترادف تھا۔ اور اس کے ایک ایک بوسے میں لذت و سرور کا ایک غیر فانی طوفان پنہاں تھا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا دنیا جہاں کی لذتیں اس کے ایک بوسے کا پاسنگ ہیں۔ وہ کافی عرصہ تک بازغہ کے لب لعلیں اور رخسار سے اکتساب لذت کرتا رہا۔ آخر جب وہ لذت و سرور کے اس طوفان میں پوری طرح غرق ہو گیا۔ تو اس نے آہستہ سے بازغہ کے کان میں کچھ کہا۔ بازغہ کہنے لگی۔ "نہیں نہیں منذر! یہ نہیں ہو سکتا۔ اس بات کا ابھی وقت نہیں آیا" لیکن منذر کب ماننے والا تھا۔ وہ جوش اور ہیجان میں مدہوش ہو رہا تھا۔ اس لئے کہا۔

"آہ میری پیاری بازغہ! ایسی باتوں کا یہی وقت ہوتا ہے۔ اگر اب نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ وقت سے فائدہ اٹھاؤ۔ خدا جانے کل کیا ہو جائے"

اس قسم کی دیگر چکنی چپڑی باتیں کر کے منذر نے بھولی بھالی بازغہ سے لذت باغ حسن کی گلچینی کرنے کی اجازت لے لی۔ وہ کافی دیر تک بازغہ کے باغ حسن کی گلچینی

کر کے اس کے فانی جسم سے غیر فانی لذات کا اکتساب کرتا رہا۔

جب وہ وصال سے شاد کام ہو چکے۔ تو بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق غور کرنے لگے۔ بازعہ کہنے لگی۔ "ہم کب تک اس طرح چھپ چھپ کر چوروں کی طرح ملاقاتیں کرتے رہیں گے"۔

منذر کہنے لگا "بازعہ جدائی کے دن ختم ہو گئے۔ اب وصال کے دن آرہے ہیں۔ میں نے ایک تجویز سوچی ہے۔ جس سے تم ہمیشہ کے لئے میری ہو جاؤ گی"۔

بازعہ کہنے لگی "وہ تجویز کیا ہے؟" منذر نے جواب دیا۔ "ابھی وقت نہیں آیا جب وقت آئے گا۔ تو تمہیں خود ہی اس کی اطلاع مل جائے گی"۔ اور اس کے بعد وہ اسی طرح پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ اور سیاہ رات آہستہ آہستہ اپنا سفر طے کرتی گئی۔

قبیلہ بنو عارث کے ایک نوجوان کو جس کا نام اصمعی تھا۔ جیدہ سے بہت محبت تھی۔ اور اس نے اپنی محبت کو کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ بلکہ دل ہی دل میں وہ اپنی محبوبہ کو یاد کیا کرتا تھا۔ اس کا معمول تھا۔ کہ وہ رات کے وقت بے قراری کے عالم میں اپنے خیمے سے باہر نکل آتا۔ اور دھیمے دھیمے سروں میں جیدہ کے عشق اور فراق میں سوز و گداز میں اشعار گاتا ہوا صحرا کی طرف نکل جاتا۔ اور اکثر ساری ساری رات اشعار خوانی میں بسر کر دیتا۔ لیکن جب وہ صحرا کی طرف جاتا۔ تو جیدہ اور بازعہ کے خیمے کے قریب سے ہو کر جاتا۔ کہ شاید کبھی اس کی محبوبہ مہربان ہو کر اسے اپنے خیمے میں بلا لے۔ لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوتی ———— کیونکہ جیدہ کو کسی مرد سے محبت نہ ہو سکتی تھی۔ اسکی طبیعت ہی کچھ اور قسم کی تھی، وہ عشق کے سوز و گداز اور تاثیر سے ناواقف تھی۔ اور نہ وہ چاہتی تھی۔ کہ کسی سے لگا کر اپنی راتوں کو سوگوار کرے۔ اس لئے اس نے اپنے قبیلے کے کسی نوجوان یا دیگر شخص کو کبھی نظر التفات سے نہ دیکھا تھا۔ قبیلے کے نوجوان

سرد آہیں بھرتے رہ جاتے تھے۔ آج رات بھی حسبِ معمول اصمعی صحرا کی طرف جا رہا تھا جب وہ جیدہ اور بازعہ کے خیمے کے قریب پہنچا۔ تو یہ دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ کہ خیمے کے اندر سے کسی مرد کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ خیمے کے قریب آ گیا۔ اور کان لگا کر بازعہ اور منذر کی باتیں سننے لگا۔

وہ بہت دیر تک خیمے کے پاس کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔ اور جب اسے یہ پتہ چلا کہ خیمے میں منذر ہے۔ جو قبیلہ بنو حارث کے دشمن قبیلہ بنو حازر کا فرد ہے۔ اور قبیلے کے سردار کی بیٹی سے عشق و محبت کی باتیں کر رہا ہے۔ تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جوش حسد، رقابت، غیرت، الغرض اس کے تمام منتقمانہ جذبات بیدار ہو گئے۔ اور اس کا جی چاہتا تھا۔ کہ اسی وقت خیمے کے اندر جا کر [illegible] منذر کو قتل کر دے۔ جو اس کے قبیلے کی آبرو لے رہا ہے۔ وہ غصے سے کانپنے لگا۔ اور جوشِ غضب میں اپنے ہاتھ کی مٹھیاں بھینچنے لگا۔ اور پھر یکایک اسی جوش کی حالت میں اپنے قبیلے کے دیگر خیموں کی طرف بھاگا۔ تاکہ قبیلے کے دوسرے لوگوں کو قبیلہ غیر کے فرد منذر کی موجودگی کی خبر دے سکے۔ وہ زور سے بھاگا۔ یہاں تک کہ اس نے یہ بھی نہ دیکھا۔ کہ اس کے راستے میں ایک رسہ بندھا ہوا ہے۔ اصمعی اس سے الجھ کر گر گیا۔ اور اس کے گرنے سے ایک دھماکا ہوا۔ جس سے جیدہ اور بازعہ کو پتہ چل گیا۔ کہ ان کے خیمے کے باہر کوئی شخص ہے۔ چنانچہ جب بازعہ نے باہر جھانکا۔ تو اصمعی کو پایا۔ اس نے جھٹ منذر کو بتا دیا۔ کہ فوراً چلا جائے۔ مبادا کوئی آفت آ جائے۔ یہ سن کر منذر جلدی جلدی کپڑے پہن خیمے سے باہر نکل گیا۔ اور اپنے سبک رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر یہ جا وہ جا۔ پل بھر میں قبیلۂ بنو حارث کے مکانوں کو بہت پیچھے چھوڑ گیا۔

اس کے جانے کے فوراً ہی بعد جیدہ اور بازعہ کے خیموں کے قریب سے دس بیس گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں رات کی تاریکی میں سکوت کو توڑتی ہوئی سنائی دیں۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ہمارے قبیلے کے لوگ منذر کا تعاقب کر رہے

میں ہے یہ سوچ کر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ کہ کہیں یہ لوگ اس کے محبوب کو پکڑ نہ لیں کیونکہ اسے اس صورت میں پتہ تھا۔ کہ اس کے محبوب کا کیا انجام ہوگا۔

آخر کار گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں آنی بالکل بند ہو گئیں۔ قبیلہ بنو عارث کے گھوڑے بہت دور جا چکے تھے۔ بازغہ نے ڈرتے ڈرتے اپنی عم زاد بہن سے کہا: "آخر جیدہ اس کا انجام کیا ہوگا؟" جیدہ کہنے لگی: "ایک خونریز جنگ اور کیا۔" پھر دونوں رونے لگیں۔ کہ کہیں ان دونوں پر اور بازغہ کے محبوب پر کوئی آفت نہ آئے۔ اور انہیں اسی طرح روتے دھوتے کافی عرصہ گزر گیا۔ یہاں تک کہ سپیدۂ سحری مشرق سے نمودار ہو گیا۔ اور اس کے تھوڑے عرصے کے بعد پھر گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ قبیلہ بنو عارث کے شہسوار واپس آ رہے تھے۔ بازغہ نے افسوسناک لہجہ میں کہا: "یہ وحشی لوگ خدا کرے۔ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئے ہوں۔" لیکن اس کا یہ خیال غلط تھا۔ کیونکہ جب یہ لوگ اس کے خیمے کے قریب سے گزرے۔ تو اس کو معلوم ہوا۔ کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے ہیں۔

اس رات کے بعد بازغہ نے اپنے محبوب کو پھر کبھی نہ دیکھا۔ اس کی باقیماندہ زندگی حسرت و یاس کا ایک مرقع بن گئی تھی۔ اس نے تمام عمر شادی نہ کی۔ اس کا معمول تھا۔ کہ وہ اکثر رات کے وقت صحرا کی طرف نکل جاتی۔ اور وہاں اپنی سہیلی اور عم زاد بہن جیدہ کے سامنے بڑے موزوں گداز سے منذر کی یاد میں اشعار گاتی۔ اس کے اشعار اتنے پُر الم اور جذبات حسرت و افسردگی کا آئینہ ہوتے تھے۔ کہ جو کوئی ان کو سن لیتا تھا۔ اپنے آنسو ضبط نہیں کر سکتا تھا۔ ہم ذیل میں چیدہ چیدہ اشعار درج کرتے ہیں۔ تاکہ قارئین کو اس کے زور بیان اور تخیل کی سادگی اور دیگر خوبیوں کا پتہ چل جائے۔ ایک مرثیہ میں وہ اپنے محبوب کا ماتم کرتے ہوئے کہتی ہے۔

"تم اس بہار کی مانند تھے۔ جو ایک دفعہ آکر ہمیشہ کے لئے گزر جائے۔ یا صحرا میں کھلے ہوئے اس پھول کی طرح جسے بادِ سموم جلد ہی کملا دے۔"

"آسمان پر ستارے نہیں ہیں۔ بلکہ یہ میری آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ہیں۔ جو آتشیں صورت میں آسمان پر جلوہ گر ہیں"۔

"میں اپنے محبوب کی یاد میں اس وقت تک روتی رہوں گی۔ جب تک میری آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک قطرہ بھی باقی ہے۔

اور میں اس کا ماتم اس وقت تک کرتی رہوں گی۔ جب تک لوگ میرا خود ماتم نہ کرنے لگیں۔

"زندگی میں تو موت نے ہمیں جدا کر دیا۔ لیکن مر کر موت بھی ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ ہم عنقریب ایک دوسرے سے پھر ملیں گے"۔

ایک اور نظم میں اپنے اُن چند دنوں کا ذکر کرتی ہے۔ جب اس کا محبوب منذر اس کے پاس ہوتا تھا۔ اور دونوں عیش و عشرت میں اپنا وقت گزارتے تھے۔

"ان چند دنوں کی یاد میرے دل سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ جب کہ میں اور میرا محبوب کھجوروں کے سائے تلے روز و شب الفت کی تیز شراب پیتے تھے۔

"اللہ زندگی ایسی معلوم ہوتی تھی۔ گویا بہار کا کوئی کھلا ہوا پھول ہے۔ اے کاش یہ دن اسی طرح رہتے۔

"میں ہوں اور میرا محبوب، چاندنی رات ہو، چشمے کا کنارہ اور کھجوروں کا جھنڈ بس میری زندگی کا معراج یہی ہے۔

"کھجوروں کے بور کی خوشبو کی طرح میرے مشام جان کو منذر کی محبت کی نکہت معطر رکھتی ہے۔ محبت کی خوشبو تمام دیگر خوشبوؤں سے زیادہ لطیف اور سرور آگیں ہے"۔

اس کی بعض نظمیں خاصی طویل ہیں۔ اور ان میں جذبات انسانی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کہ وہ ایک بھڑکتا ہوا شعلہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور سننے والوں پر وجد کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ یہ اشعار ایسے لطیف اور نازک ہیں کہ ترجمے کے متحمل نہیں ہو سکتے بہر حال چند ایک کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

"میرے آتشیں جذبات میرے جسم اور میری روح کو جلا دیتے ہیں۔ کون ہے؟ جو میرے ان جذبات کو سرد کرے"

"جب میرا محبوب میرے قریب آتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا میرا جسم جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائے گا"

لیکن جب وہ میرے ساتھ ریت کے بستر پر لیٹتا ہے۔ تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا وہ میری خواہشوں کو آب حیات سے بجھا رہا ہے۔ اس کے مضبوط اور توانا جسم کا مس میرے جسم اور میری روح کو قرار بخشتا ہے۔ کاش وہ ہمیشہ اسی حالت میں میرے ساتھ رہے"

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ باذنہ نے ساری عمر شادی نہ کی۔ اور اگرچہ اس کی سہیلی نے بعد میں اصمعی کے ساتھ شادی کر لی۔ لیکن اس نے ساری عمر کسی غیر مرد کی طرف نگاہ محبت سے دیکھنا گناہ سمجھ لیا۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں مر گئی۔ اس کے مرنے کے متعلق دو حکایتیں مشہور ہیں۔ خدا جانے ان میں اصلیت ہے بھی یا نہیں۔ ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایک دفعہ اس کو منذر کا ایک خنجر مل گیا۔ وہ اسے پا کر ایسی خوش ہوئی۔ کہ گویا اسے بذات خود منذر مل گیا ہے۔ اس نے اس خنجر کو آنکھوں سے لگایا، چوما، اور پھر ایک رات یہ خنجر چپکے سے اپنے سینے میں بھونپ لیا۔ لیکن بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ یہ محض افسانہ ہے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ وہ اپنی آخری عمر میں منذر کی یاد

میں اتنی روتی تھی۔ کہ اس کی آنکھوں کی بینائی زائل ہو گئی۔ اور ایک دفعہ رات کو معمول کے مطابق صحرا میں اپنے اشعار پڑھتی جا رہی تھی۔ کہ راستے میں ایک گڑھے میں گر کر مر گئی۔ صبح لوگوں نے اس کی لاش کو اس گڑھے میں پایا۔

اگرچہ بانرہ اور منذر دونوں مر چکے ہیں۔ لیکن ان کے اشعار ابھی تک اہل عرب کی زبانوں پر رواں ہیں۔ وہ انہیں اب بھی اسی طرح مزے لے لے کر پڑھتے ہیں جس طرح قدیم زمانے کے لوگ۔ اور ان میں جو لطف اور سوز و گداز ہے وہ کسی دوسرے عرب شاعر کے کلام میں مشکل ہی سے ملے گا۔ راتوں کو صحراؤں میں بدو لوگ جب اونٹوں کی مہار پکڑ کر سفر کرتے ہیں۔ تو نہایت سوز و گداز کے عالم میں بانرہ کے اشعار گاتے ہیں اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا بانرہ اور منذر دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں۔ بانرہ اپنی آخری نظم میں کہتی ہے :-

"میں خوش ہوں کہ اب میرا آخری وقت قریب آگیا ہے۔ کیونکہ اب میں اپنے محبوب کا دائمی وصال حاصل کروں گی۔"

"بعض لوگ موت سے کس قدر ڈرتے ہیں۔ انہیں پتہ نہیں کہ موت تو ایک سیڑھی ہے۔ جس کے ذریعہ ہم اپنے محبوبوں سے ملتے ہیں۔"

"جب میں مر جاؤں۔ تو مجھے ایسی جگہ دفن کرنا۔ جہاں کھجور کا درخت سایہ کئے ہو۔ اور ایک چشمہ شیریں پانی کا ہو۔"

"کیونکہ ایسی جگہ میرے محبوب کو بہت پسند تھی۔ اور اس کی روح اب بھی ایسی جگہوں پر آتی ہو گی۔ میری تمام خواہشیں شبنم کے قطروں کی طرح اڑ چکی ہیں۔ سوائے ایک خواہش کے۔ کہ میں منذر کو دوبارہ اسی شکل میں دیکھوں۔"

ولیعہد جرمنی کی معشوقہ

لوسی جب لندن پہنچی تو اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی باقی نہ تھی۔ وہ تمام روپیہ سفر ہی میں لٹا چکی تھی۔ آخر اس نے ملازمت کی ٹھانی۔ ایک ہوٹل کے مالک نے اس کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر اسے اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ لوسی کے آتے ہی ہوٹل والوں کی قسمت جاگ اٹھی۔ شہر کے رنگین مزاج نوجوان اور اوباش ہوٹل میں آ کر بے دریغ روپیہ لٹانے لگے۔ کیوں؟ اس لئے کہ لوسی مسکرا مسکرا کر اور ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتی تھی۔ ایسی باتیں، جو انہیں مضطرب کر دیتی تھیں۔

تھوڑے ہی عرصے میں لوسی اپنے غیر معمولی حسن اور سحر آفریں اداؤں کی وجہ سے قرب و جوار میں مشہور ہو گئی۔ مصور آ کر اس کی تصویریں اتارنے لگے۔ اور شہر کے امراء نے ہوٹل میں آ آ کر اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے۔ اس کا نور کے سانچے میں ڈھلا ہوا بدن دیکھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتا تھا۔ اس کی شوخ نگاہیں دلوں کو سینوں سے باہر کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتی تھیں۔ اور اس کا دلکش انداز خرام آمدِ صبح کی نور آفرینی کو شرماتا تھا۔

ہوٹل کا ہر گاہک لوسی کے حسن کی تعریفیں کرتا تھا۔ ہر ایک یہی کہتا: "تم ایسی حسین و جمیل لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی"۔

پہلے پہل تو وہ اپنے حسن کی تعریفیں سن کر خوش ہوا کرتی۔ لیکن لوسی سے ایسے فقرے کہنے والوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی۔ کہ وہ اب لوگوں کے اظہار محبت سے بہت تنگ آ گئی۔

ان "خوشامدوں" کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوسی مغرور ہو گئی۔ وہ اکثر سوچا کرتی۔ کہ ہوٹل کی

ملازمت سے میرا درجہ بہت بلند ہے۔ ملازمت میرے لئے باعث ذلت ہے۔ مجھ جیسی حسین لڑکی کسی لکھ پتی کی بیوی ہونی چاہیئے۔

لوسی ہوٹل میں آنے والے سینکڑوں خوش پوش نوجوانوں کی طرف ملتفت ہو چکی تھی۔ لیکن کوئی بھی اس کے "معیار" پر پورا نہ اترتا تھا۔ اسے امارت کی تلاش تھی۔ ہوٹل میں آنے والوں کا لباس تو بہت خوش نما ہوتا تھا۔ لیکن جیبیں خالی ہوتی تھیں۔ جب وہ لوسی سے اظہار عشق کرتے۔ تو وہ بھی محبت کا جواب محبت سے دیتی۔ جب ان کی محبت کچھ مرحلے طے کر جاتی۔ تو لوسی پر حقیقت کھلتی۔ کہ میرا چاہنے والا بالکل مفلس اور قلاش ہے۔ اور میرے التفات کے قابل نہیں۔ چنانچہ وہ فوراً اس سے کنارہ کش ہو جاتی اسے امیروں کی تلاش تھی۔ امیر اس سے اظہار عشق تو کرتے تھے۔ لیکن اس سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتے تھے۔ محض اس لئے کہ وہ ہوٹل کی ایک ملازمہ تھی۔

اب اس نے محبت کا معیار بلند کر لیا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ امرا کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر سوسائٹی میں اپنا درجہ بلند کرے گی۔ اس کے دل میں امرا کی ہوس پرورش اور خلوص نا آشنائی کے خلاف جذبات بھڑک اٹھے۔ اور اس نے انتقام کی ٹھان لی۔

ایک جنٹلمین نوجوان بھی لوسی کو دل دے چکا تھا۔ اس کا اور لوسی کا افسانۂ محبت بہت درد انگیز ہے۔ غالباً یہ پہلا نوجوان تھا۔ جو لوسی کی آتش عشق میں جل کر تباہ ہو گیا۔ اس نے لوسی سے سچی محبت کی۔ لیکن لوسی نے محض اس بنا پر اس کی محبت کو ٹھکرا دیا۔ کہ وہ ایک عالی خاندان کا فرد تو ہے لیکن امیر نہیں۔

خوبصورت باغ رنگ رنگ کے پھولوں سے رشک ارم بنا ہوا تھا۔ ہوا درختوں میں سرسرا رہی تھی۔ اور دور سے بار بار کسی پرندے کے چہکنے کی دلنشین آواز آتی تھی۔ خورشید خاوری افق کی ندیا جھیل میں آخری سسکیاں لیتے ہوئے ڈوب رہا تھا۔

مارک ادھیڑ عمر کا ایک لکھ پتی، اور لوسی دونوں ایک بنچ پر بیٹھے تھے ـــــ دونوں کی نگاہیں پھولوں کے تختے پر تھیں۔ لوسی اس حسین منظر میں ایک تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ مارک کے دل میں محبت اور ہوس کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن لمحہ بلمحہ تیز ہو رہی تھی۔ کیونکہ آج اس کے مرتعش ہونٹ لوسی کے خوبصورت ہونٹوں کا لمس لطیف چرانے کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔

اس نے لوسی کے گدراتے ہوئے مرمریں بازو پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ اور کہنے لگا۔ "لوسی تمہارا حسن ان پھولوں سے زیادہ دلکش اور نازک ہے۔ تمہاری دید سے میری آنکھوں میں نور ہے۔ اور تمہاری چاہت سے میرے دل کا قرار وابستہ ہے۔ کیا بتاؤں مجھے تم سے کس قدر محبت ہے؟"

لوسی اپنے عاشق کے چہرے کی کیفیات سے اس کے دل کا تمام حال معلوم کر چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آج اس کا لکھ پتی عاشق اس کے قدموں میں لوٹنے کے لئے بیتاب ہو رہا ہے۔ اس نے مسکرا کر اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔ اور کہنے لگی "محبت؟ اگر تمہیں محبت ہوتی۔ تو تم مجھ سے شادی کی درخواست کرتے"!

مارک کہنے لگا۔ "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ شادی کے راستے پر کونسی مشکلات حائل ہیں۔" اب مارک نے بڑھ کر اپنی محبوبہ کا منہ چومنا چاہا۔ لوسی بھانپ گئی۔ اس نے موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ کہنے لگی "ٹھہرو! اچھا اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے۔ تو میری بات مانو گے؟"

مارک نے جواب دیا "کیوں نہیں"

لوسی کہنے لگی۔ "تم مجھے شادی کے لئے پانچ ہزار پونڈ دے دو۔ تو میں تمہاری ہی ہو جاؤں گی"

اتفاق سے چیک بک مارک کے پاس تھی۔ اس نے فوراً اپنی محبوبہ کو پانچ ہزار

پونڈ کا چیک لکھ کر دے دیا ـــــــ شام کی تاریکی اور سناٹے میں ایک سایہ دوسرے سایہ کی جانب بڑھا۔ اور لوسی اور مارک، دونوں کے ہونٹ ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے۔ گویا امارت پسند لوسی نے اپنا ایک بوسہ پانچ ہزار پونڈ میں فروخت کیا۔

لوسی کو برلن آئے زیادہ مدت نہیں گذری تھی۔ کہ افریقہ کی نو آبادیات کے جرمن گورنر جنرل جس کی فان پٹ ہامیر سے جو ان دنوں برلن میں تھا۔ اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ پہلی ہی نظر میں لوسی پر ہزار جان سے فریفتہ ہو گیا۔ لوسی اپنی کامیابی پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اسے تو صرف دولت، عزت اور شہرت درکار تھی۔ پٹ ہامیر نے اسے اپنی "بھتیجی" بنا لیا۔ اور یہ "بھتیجی" اپنے مفتون اور شیدا "چچا" کے ہمراہ افریقہ چلی گئی۔ وہاں شان و شوکت اور جاہ و حشمت نے اس کے قدم لئے۔ اب پٹ ہامیر اور لوسی دونوں ایک عالیشان محل میں محبت کی راتیں بسر کرنے لگے۔ معمر گورنر جنرل اپنی نوخیز محبوبہ کی ناز برداریوں میں اس قدر محو ہو گیا۔ کہ اسے دنیا اور مافیہا کا ہوش نہ رہا۔ افریقی سلطنت کے انتظام میں خلل آنے لگا۔ جب قیصر جرمنی کو خبر ہوئی۔ کہ گورنر جنرل ایک حسینہ کے دام محبت میں اسیر ہو کر دن رات اس سے محبت کرنے میں بسر کرتا ہے۔ تو اس نے اسے معطل کر دیا۔

لوسی کا اب وہاں ٹھہرنا بیکار تھا۔ وہ تو امارت کی شیدا تھی۔ پٹ ہامیر کے معطل کے بعد فوراً ہی وہ ایک دن اس کے محل سے ایک سنہری چڑیا کی طرح پھر سے اڑ گئی۔ اور یہ بڈھا کف افسوس ملتا رہ گیا۔

اب لوسی کسی نئے عاشق کی تلاش میں افریقہ سے جرمنی روانہ ہوئی۔ اس کی آمد سے پہلے وہاں کی پولیس کے ایک افسر اعلےٰ کو اطلاع دی گئی تھی۔ کہ ایک نہایت خطرناک حسینہ افریقہ سے جرمنی آ رہی ہے۔ "خطرناک" اور "حسینہ" ان دو الفاظ نے پولیس افسر کو متوجہ کر لیا۔ اور وہ اس حسینہ کو سرزنش کرنے اور اس کی "خطرناک سرگرمیوں"

کی نگرانی کرنے کے لئے خود اس سے ملا۔ لوسی اس وقت نہایت ہی خوبصورت لباس زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اس نے دورانِ گفتگو میں پولیس افسر کو وہ ناز نخرے دکھائے کہ یہ حضرت اس پر لٹو ہو گئے۔ پولیس افسر نے اس سے استدعا کی کہ وہ اس کے ساتھ [illegible] دنیا کی سیاحت کرنے پر رضامند ہو جائے۔ لوسی ایک زہد شکن انگڑائی لے کر پولیس افسر کو اپنے سینے کا دلکش زیر و بم دکھاتے ہوئے بولی:-

"اگر تم نے چند مہینوں میں میری جوانی کی بہار لوٹ لی اور میرے حسن کی کلی کی طرح مسل ڈالا تو میں دنیا میں بے یار و مددگار اور مفلس و قلاش ہو جاؤں گی۔ کیا تم اس بات کی کوئی ضمانت دے سکتے ہو؟"

پولیس افسر نے فوراً اسے پچیس ہزار مارک کا چیک پیش کیا۔ اور اب یہ دونوں سیاحت کرنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ پولیس افسر اپنی نوخیز محبوبہ کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا اور وہ راستے میں دو دو ہاتھ سے روپیہ لٹاتا گیا۔ اس نے لوسی کے لئے بہت سے قیمتی تحائف بھی خریدے۔ اور اس کی نذر کر دیئے۔ غرض کہ اس نئے عاشق نے بدیریغ اپنی تمام دولت لوسی پر نچھاور کر دی۔ یہاں تک کہ اس کے پاس ایک کوڑی بھی باقی نہ بچی۔

جب لوسی نے دیکھا کہ اس کا عاشق کنگال ہو گیا ہے۔ تو ایک دن اس نے اس کی عنایت کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے رخصت چاہی۔ اور اس کی دی ہوئی ایک قیمتی موٹر میں بیٹھ کر یہ فو چکر ہو گئی۔

اس طرح لوسی نے کئی لکھ پتی اور کروڑ پتی نوجوانوں اور بڈھوں کو لوٹا۔ لاتعداد شخصوں سے محبت کی۔ بہت سا روپیہ کمایا۔ اور بہت سا قمار بازی میں ضائع کیا۔

ایک مرتبہ اس کے ایک مدّاح نے اس سے ازراہِ مذاق کہا کہ تمہارے مطالبات تو ولیعہد جرمنی ہی پورے کر سکتا ہے۔ لوسی مسکرا کر کہنے لگی "[illegible] ہی ہو گا"

ایک دن اتفاق سے لوسی اور ولیعہد جرمنی کی ملاقات [illegible] [illegible] ہو گئی۔ چنانچہ

کوئی شخص لوسی کے حسن کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ اس لئے ولیعہد جرمنی بھی پہلی ہی ملاقات میں اس کا دیوانہ ہوگیا۔

لوسی نے اپنے تمام عاشقوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ اور ولیعہد کے شاندار محل کی زینت بن گئی۔

ولیعہد نے اپنی محبوبہ کی ناز برداریوں میں پانی کی طرح دولت بہا دی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ وہ اسے شادی کا پیغام دینے پر مجبور ہوگیا۔

جب قیصر جرمنی کو معلوم ہوا۔ کہ ولیعہد کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ تو اس نے فوراً ہی لوسی کو قتل کر دینے کے خفیہ احکام جاری کر دیئے۔

یہ کام چند جاسوسوں کے سپرد ہوا۔ لیکن جاسوسوں کے افسر اعلےٰ نے جب لوسی کو دیکھا۔ تو وہ اس پر فریفتہ ہوگیا۔ اور اس نے لوسی کو تمام حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ کہ اس کی خیر اسی میں ہے۔ کہ وہ جلد از جلد جرمنی سے چلی جائے۔

چنانچہ ایک دن لوسی اپنے نئے عاشق کے محل سے غائب ہوگئی۔ ولیعہد اس کی فرقت کی تاب نہ لاسکا۔ اور دیوانوں کی طرح اسے ملک کے چپے چپے میں تلاش کرنے لگا۔ لیکن لوسی کا کچھ پتہ نہ چلا۔

آخر ۱۹۲۷ء میں اس رنگین مزاج عورت نے جو بڑے بڑے امرا کی آنکھوں کا نور اور دل کا قرار تھی۔ نہایت ہی مفلسی کی حالت میں وفات پائی۔

اس کی قبر اب تک ایک درخت کے سائے میں موجود ہے ہوا چیختی ہوئی آتی ہے۔ اور اس کی قبر سے خاک اڑا کر لے جاتی ہے ——

یہ ہے اس حسینہ کا خوفناک انجام!

حبشی کی جلیل المرتبت محبوبہ

عدلیس ابابا کی شہری آبادی سے کچھ فاصلے پر وہ خوبصورت کوٹھی ایک بالکل تنہا جگہ پر واقع تھی۔ کاؤنٹس کیر مبلی کی صحت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ وہ شہر کی گھنی آبادی کو خیرباد کہہ کر اس تنہا کوٹھی میں مقیم تھی۔ کاؤنٹس ایک نہایت ہی متمول بیوہ تھی۔

جب آسمان کا خوبصورت موتی شفق کے چمکیلے سمندر میں غوطہ لگاتا۔ وہ اپنے کمرے سے اٹھ کر اپنے نوکروں کے پاس آ بیٹھتی۔ اور ان سے افریقہ کے پراسرار اور وحشت زا جنگلوں سے متعلق طرح طرح کے خوفناک افسانے سنا کرتی۔

نوکر گھر کے تمام کام کاج سے فارغ ہو کر اور کھانا کھا کر صحن سے باہر کھجوروں کے ایک گھنے جھنڈ کے نیچے جا بیٹھتے۔ وہ بھی اپنی آرام کرسی اپنی ایک نوکرانی سے اٹھوا کر وہیں جا بیٹھتی۔ اور انہیں ٹوٹی پھوٹی زبان میں انگریزی کی کسی کتاب سے دلچسپ افسانے سنانی۔ تمام نوکرانیاں اور نوکران افسانوں کو بے حد دلچسپی سے سنتے۔ اور بہت محظوظ ہوتے۔

کاؤنٹس کو موسیقی سے بے حد شغف تھا۔ رات کو جب کھجوروں کے جھنڈ سے چاند اپنا چمکتا ہوا سر باہر نکالتا۔ اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چلتیں۔ گھر کے نوکر اور ان کی مالکہ سب سیر کے لئے باہر نکل جاتے۔ اکثر ایک تالاب نما چشمے کے کنارے جا بیٹھتے۔ کاؤنٹس موسیقی کی بے حد دلدادہ تھی۔ وہ اپنا وائلن ہمراہ لے جاتی۔ اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر اپنی آتش نوائیوں سے اپنے بھولے بھالے حبشی نوکروں

نوکرانیوں کو مسحور کرتی۔

کاؤنٹیس کے کل نوکروں کی تعداد پانچ تھی۔ یہ سب کے سب حبشی تھے ان میں سے دو تو عورتیں تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی اور ایک بالکل نوجوان۔ ایک دس بارہ سال کا لڑکا۔ اور دو نوجوان حبشی۔ ان میں سے ایک کا نام نارو تھا۔

جب کاؤنٹیس گا چکتی۔ تو وہ اپنے نوکروں سے فرمائش کرتی۔ کہ اب تم مجھے کوئی "پہاڑی گیت" سناؤ۔ ادھیڑ عمر کی حبشن جس کا نام الڈا تھا۔ فوراً اپنی بھونڈی سی آواز میں گانے لگتی۔

دوسری نوجوان عورت جس کا نام گورا تھا۔ پہلے کچھ ہچکچاتی۔ اور لیں و پیش کرتی لیکن مالکہ کی طرف سے پیہم اصرار ہونے پر اپنی سریلی آواز میں درد انگیز گیت گاتی۔ اگرچہ یہ گیت مالکہ کی سمجھ میں نہ آتے۔ تاہم اس کے دل پر انہیں سُن کر ایک خاص اثر ہوتا۔ کاؤنٹیس، نوجوان حبشی نارو کے سوا ہر ایک سے کئی کئی بار گیت سن چکی تھی۔ گورا کئی بار اپنی مالکہ سے کہہ چکی تھی۔ کہ نارو بہت اچھا گاتا ہے۔ اگر آپ اس کا گانا سنیں۔ تو حیران ہو جائیں۔ لیکن نارو نے اپنی مالکہ کے اصرار کے باوجود کبھی مالکہ کے سامنے کوئی "پہاڑی گیت" سنانے کی جرأت نہ کی۔ وہ اپنی مالکہ کے سامنے گانے سے شرماتا تھا۔

اگر کوئی اور انکار کرتا۔ تو شاید کاؤنٹیس جھڑک کر اس کا مزاج درست کر دیتی۔ لیکن معلوم نہیں کیوں کاؤنٹیس بھی نارو سے کچھ ایسی مرعوب سی رہتی تھی۔ کہ "اسے بار بار اس سے کوئی تقاضا" کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ شاید یہ اس وجہ سے تھا۔ کہ نارو جب سے کاؤنٹیس کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اس کی طبیعت میں ایک انقلاب آگیا تھا۔ وہ اکثر خاموش رہا کرتا۔ اور اپنی مالکہ سے بھی بہت کم بات کرتا تھا۔

زارو چارپائی پر لیٹا تھا۔ اس کے تمام کپڑے خون سے لت پت تھے۔ کاؤنٹیس چارپائی کے بالکل قریب اپنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ گورا کہنے لگی۔ "زارو نے تو کمال ہی کر دیا۔ بی بی شیر بھی تو ایسا بڑا اور خوفناک تھا کہ کئی گولیوں سے بھی ہلاک نہ ہو سکا۔ اب آپ کبھی شکار کو نہ جائیں۔ اگر زارو نہ ہوتا۔ تو اس موذی جانور نے آپ پر حملہ تو کر ہی دیا تھا۔ نہ جانے کیا ہوتا۔ بی بی! آپ تو مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ ——— بی بی آپ کو زارو نے دھکا دے کر پرے گرا دیا۔ اور آپ کی بجائے خود شیر سے لڑنے لگا۔ میں تو حیران ہوں کہ اس شریر نے آپ کو دھکا دینے کی جرأت کیسے کی؟"

کاؤنٹیس یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں زارو کی نیم وا آنکھوں پر گڑی تھیں۔ زارو بے ہوش پڑا تھا۔ کاؤنٹیس نے اپنے نازک سے مرمریں ہاتھ میں زارو کا مضبوط سیاہ ہاتھ لیا۔ اور نبض کی رفتار معلوم کرنی چاہی اتنے میں زارو نے آنکھیں کھول دیں۔ اور ایک ناتوان سی نگاہ کاؤنٹیس کے چہرے پر ڈالی۔ اور پھر فوراً آنکھیں بند کر لیں۔

کاؤنٹیس نے نہایت محبت آمیز لہجے میں اس سے پوچھا۔ "زارو اب تم کیسے ہو؟"

زارو۔ "اچھا ہوں" کہکر خاموش ہو گیا۔

زارو کا بازو شیر سے کشمکش کرنے میں اس قدر زخمی ہو گیا تھا۔ کہ بہت سا خون اب تک بہہ چکا تھا۔ اگر اتفاق سے کاؤنٹیس کے پاس مرہم پٹی اور خون بند کرنے کا سامان نہ ہوتا۔ تو شاید زارو کا بچنا ناممکنات سے ہوتا۔ کاؤنٹیس آخر زارو کی کیوں ممنون احسان نہ ہوتی۔ اس نے اس کی جان بچائی تھی۔ وہ اس سے باتیں کرتی۔ تو وہ جھینپ جاتا۔ اور اس کی نگاہیں جھک جاتیں۔

دن مہینے اور پھر ایک سال گزر گیا۔ اب زآرو اچھا ہو چکا تھا۔ ایک دن زآرو کاؤنٹس کا کمرہ صاف کر رہا تھا۔ گورا باہر کام کاج میں مصروف تھی۔ اتفاق سے وہ کسی کام کے لئے اندر کمرے میں آئی۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ زآرو کاؤنٹس کی تصویر کو سامنے رکھے اس پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔ اور اس کی دید میں اس قدر محو ہے۔ کہ اسے تن بدن کا ہوش نہیں۔ گورا دوڑ کر واپس چلی گئی۔ اور اپنی مالکہ کو بلا لائی۔ وہ اب بھی تصویر کو سامنے رکھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کاؤنٹس زآرو کی اس مضحکہ خیز حرکت پر پہلے تو کچھ مسکرائی۔ اس کے بعد واپس چلی گئی۔ باہر آ کر اس نے گورا سے کہا۔ کہ زآرو کو کہہ دو "آج اسے ملازمت سے برطرف کیا جاتا ہے"۔

جب زآرو باہر نکلا۔ تو کاؤنٹس کا ارادہ بدل گیا۔ اور اس نے اسے بلا کر کہا۔ "خبردار ایسی فضول باتوں میں وقت ضائع نہ کیا کرو۔ اگر آئندہ ایسا ہوا تو میں تمہیں ملازمت سے جواب دے دوں گی"۔

زآرو اب بھی وہ کمرہ صاف کیا کرتا۔ لیکن اب اس نے کبھی اپنی مالکہ کی تصویر کو اس طرح گھورنے کی جرأت نہ کی۔ اب اس نے گورا سے گفتگو کرنا بالکل ترک کر دیا۔ وہ حتی الامکان اپنی مالکہ کے سامنے کبھی نہ آتا۔ اور اگر آتا بھی۔ تو اس کی نگاہیں ہمیشہ جھکی رہتیں۔ اس سے پہلے بھی اس نے کبھی اپنی مالکہ سے آنکھیں نہیں ملائی تھیں۔ اور اب تو وہ بمشکل ہی اس کے سامنے آنے کی جرأت کرتا۔

آدھی رات گزر چکی تھی۔ ہوا ساکن تھی۔ زآرو کے سوا گھر کے سب لوگ سو رہے تھے۔ زآرو اپنے کمرے میں بستر پر لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کی مالکہ کی تصویر تھی۔ جسے وہ لیمپ کی دھندلی روشنی میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا

تھا۔ کبھی وہ اُسے آنکھوں سے لگا لیتا۔ کبھی چومتا۔ کبھی سینے پر رکھ لیتا۔ ہر روز اس
کا یہی معمول تھا۔ وہ رات کو ڈرائینگ روم سے اپنی مالکہ کی تصویر جو چاندی کے
ایک فریم میں جڑی ہوئی تھی، اٹھا لاتا۔ اور رات بھر اسے اپنے سامنے رکھے
دیکھتا رہتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ دیوانوں کی طرح اس تصویر
سے اپنی مخصوص زبان میں باتیں کرتا۔ اور اظہار عشق کرتا۔ اس شب بیداری کی
وجہ سے اس کی صحت خراب ہونے لگی۔ آنکھیں رو رو کر سوج گئیں۔ سبھی حبشی
نوکر اور نوکرانیاں حیران ہو کر اس سے پوچھا کرتیں۔ کہ تمہاری آنکھوں کو کیا ہو گیا
ہے۔

خود اس کی مالکہ کو بھی یہ راز معلوم ہو چکا تھا۔ ایک بار رات کو وہ کسی کام
کے لئے اپنے کمرے میں آئی تھی۔ وہاں سے اس کی تصویر جو سامنے ہی میز پر پڑی
رہتی تھی۔ غائب تھی۔ اُسے زارو پر شک ہوا تھا۔ اور وہ دبے پاؤں زارو
کے کمرے کے پاس آکر دروازے کے ایک سوراخ سے دیکھ گئی تھی۔ کہ زارو کس
طرح اس کی تصویر کو سامنے رکھے زار و قطار رو رہا ہے۔

بھلا کاؤنٹس کو کس طرح ایک غلام سے محبت ہو سکتی تھی؟ وہ صرف تماشہ
دیکھنے کے لئے نصف شب کے قریب زارو کے کمرے تک آتی تھی۔ اور گھنٹوں
اپنے عاشق کی آہ و زاری اور اظہار عشق کا تماشہ دیکھتی رہی۔

نصف شب کا چاند پوری تابانی سے چمک رہا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل
رہی تھی۔ تمام دنیا خواب غفلت کے مزے لے رہی تھی۔ کاؤنٹس اپنے مخملین
بستر سے اٹھی اور آہستہ آہستہ دبے پاؤں زارو کے کمرے میں آئی۔ لیمپ
روشن تھا۔ زارو کے ہونٹ کاؤنٹس کی تصویر پر تھے۔ وہ ہوا کے جھونکے
کی طرح دروازے کے پٹ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ زارو کے ہاتھ سے تصویر

زمین پر گر پڑی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ کاؤنٹیس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے۔ ایک چمکدار تیز چاقو الماری میں پڑا تھا۔ زآرو نے گھبرا کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اسے اٹھا لیا۔ اور اپنے دونوں ہونٹ چاقو سے کاٹ کر کمرے کی سمت پھینک دیئے۔ خون کی ایک تیز دھار فوارے کی طرح اس کے منہ سے پھوٹ نکلی۔ اور کمرے میں خون ہی خون کے چھینٹے نظر آنے لگے۔ کاؤنٹس کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔ اور اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

زآرو گھبرایا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ خون کی ایک دھار اپنے پیچھے چھوڑتا ہوا جنگل میں غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد پھر کبھی نظر نہ آیا۔

زآرو کا یکایک غائب ہو جانا گھر کے نوکروں کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہا۔ جب وہ زارو کے متعلق کاؤنٹیس سے کچھ کہتے۔ تو اس کا چہرہ یکایک سنجیدہ ہو جاتا۔ اور وہ کچھ مغموم سی ہو جاتی۔

اس واقعہ کو دو سال گزر چکے تھے۔ وہ خون آلود چاقو اب تک کاؤنٹیس کے ڈرائینگ روم کی الماری میں پڑا تھا۔ نوکر حیران تھے کہ کاؤنٹیس ہر روز صبح اور شام تنہا جنگل میں کیوں نکل جاتی ہے۔ زآرو کے خالی کمرے میں ہر روز رات کو ایک لیمپ کیوں روشن رہتا ہے۔ اور کبھی کبھی نصف شب کو وہ اپنے بستر سے اٹھ کر زارو کے کمرے میں کیا کرنے آتی ہے؟

سکندرِ اعظم کی خون آشام محبوبہ

سکندر اعظم کو دنیا ایک باجبروت بادشاہ اور ایک زبردست جرنیل کی حیثیت
سے جانتی ہے۔ وہ ایک سیل کی طرح اپنے وقت کی دیگر تمام قوتوں کو خس وخاشاک کی
مانند بہا کر لے گیا۔ اس کی بے پناہ قوت کا مقابلہ نہ تو شاہِ ایران دارا کر سکا۔ اور نہ
شمالی ہندوستان کا مہاراجہ پورس۔ اگر اس نے ایک طرف دارائے ایران کو ہزیمت
دی۔ تو دوسری طرف پورس کو۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود یہ باجبروت بادشاہ
اور زبردست سالار ایک بار ایک ایسی قوت سے شکست کھا گیا جس نے بارہا
دنیا کی دیگر جلیل القدر طاقتوں کو شکست دی ہے۔ یہ شکست ایسی تھی کہ دنیا آج تک
اس کی یاد نہیں بھولی۔ مگر یہ شکست اُسے کس نے دی تھی؟ اور کیسے دی
تھی؟ اس کا جواب ہمیں عہد پارینہ کی ان داستانوں میں ملتا ہے۔ جو آج بھی
دنیا کے بڑے بڑے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ اور آج ہم بھی چاہتے ہیں۔ کہ اس
داستان کو سپردِ قلم کریں۔ جو سینکڑوں برس گزرنے کے باوجود ہنوز اسی طرح
دلچسپ معلوم ہو گی۔ جس طرح کہ موجودہ عہد کی کوئی رنگین داستان!

(۱)

آج سے دو ہزار سال قبل ایران میں دریائے پلوار کے کنارے ایک پُر رونق بستی
تھی جس میں زیادہ تر یا تو ماہی گیر، یا بھیڑ بکریاں چرانے والے لوگ رہتے تھے۔ کچھ
لوگ ایسے بھی تھے۔ جن کا پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ اور بعض ایسے بھی تھے۔ جو دریا کے
ذریعے دیگر شہروں سے مال لاتے اور لے جاتے تھے۔ اس بستی میں ایک یونانی قبیلہ بھی

سکونت پذیر تھا۔ جو غالباً اپنے ملک سے جلا وطن ہو کر یہاں آ بسا تھا۔ اس قبیلے کے مرد جفاکش، جنگجو اور آہنی قوت کے مالک تھے۔ اور اس قبیلے کی عورتیں نازک اندام حسن و جمال میں بے مثال، اور عشوہ و ناز آفرینی میں لاثانی تھیں۔ اس قبیلے کی حسین و جمیل عورتوں کو دیکھ کر بہتیرے ایرانی سرداروں نے کوشش کی کہ کسی نہ کسی طرح ان میں سے ایک آدھ کو اپنے حرم میں داخل کریں۔ لیکن انہیں اس بات میں کبھی کامیابی نہ ہوتی۔ کیونکہ اس قبیلے کی ایک خصوصیت یہ تھی۔ کہ یہ لوگ اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کی خاطر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے۔ اور اگر کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھتا۔ تو پھر اسے زندہ شاذونادر ہی رہنے دیا جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ بہت کم لوگ۔ ان عورتوں کی طرف بری نگاہ سے دیکھتے۔ بلکہ بعض تو اتنا ڈرتے تھے۔ کہ جب اس قبیلے کی نوجوان لڑکیاں جوانی کے نشے میں چور اپنی کافر اداؤں کے پھول سر راہ لٹاتی ہوتی ایک قریب کے چشمے سے صبح و شام پانی بھرنے جایا کرتیں۔ تو وہ انہیں دیکھ کر اپنی آنکھیں اس طرح جھکا لیتے۔ گویا وہ آسمانی دیویاں ہیں۔ جو زمین پر از راہ سیر و تفریح اتر آتی ہیں۔ اور انہیں ایک نظر دیکھنا بھی دیکھنے والوں کو بھسم کر ڈالے گا۔

اس بستی کے قریب ایک اور ایرانی بستی تھی۔ جس کا نام شاہمپ تھا۔ اس بستی کا سردار ایک نوجوان گزدار نامی تھا۔ اس نوجوان کی ابھی تک شادی نہ ہوتی تھی۔ اور اس کی بڑی خواہش تھی۔ کہ کسی طرح اس قبیلے میں اپنی شادی رچائے۔ لیکن اس کی یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی۔ ہر بار اسے منہ کی کھانی پڑتی۔ ایک بار جب اس نے اس قبیلے کے ایک سرکردہ رکن کے سامنے شادی کا نام لیا۔ تو اس نے فوراً کمر سے اپنا پیش قبض نکالا۔ اور اسی وقت اس کے پہلو میں بھونپ دینا چاہتا تھا۔ کہ پیچھے سے گزدار کے ایک مصاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اس طرح وہ موت کے منہ سے بال بال بچ گیا۔ لیکن دونوں طرف غصے اور انتقام کی آگ برابر سلگتی رہی۔

اور دونوں کسی موزوں موقع کے منتظر رہنے لگے۔

(۲۷)

ایک دن شام کے وقت جبکہ سورج ابھی ابھی پردۂ شفق میں جاکر چھپا تھا۔ اور آسمان مغرب کی طرف ابھی تک شفق کی تجلیوں سے لالہ زار بنا ہوا تھا۔ اس بستی سے دو لڑکیاں سر پر مٹی کے مرتبان رکھے۔ اس چشمے پر پانی بھرنے کے لئے روانہ ہوئیں۔ جو ایک پہاڑی کے دامن میں سرسبز وشاداب درختوں کے ایک کنج میں بہتا تھا۔ اس وقت فضا میں ایک سکوت چھایا ہوا تھا۔ لیکن چشمے کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جو چشمے کے پانی کے پتھروں پر گرنے سے پیدا ہوتی تھی۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں جانے کے لئے آسمان پر قطاریں باندھ باندھ کر اڑ رہے تھے۔ اس وقت ایک نہایت دلکش منظر تھا۔ لیکن اس منظر میں ایک ایسی واردات وقوع پذیر ہوئی۔ جس کے نتائج بہت دور رس تھے۔ اور جس کی خون آشامیوں کی گونج مدت العمر تک گونجنے والی تھی۔

یہ دونوں لڑکیاں جنکی عمریں علی الترتیب چودہ اور پندرہ برس ہونگی۔ نہایت حسین اور کافر ادا تھیں۔ ان کے حسن ملیح کی ہوش ربا تجلیوں کے آگے دنیا بھر کی حسین اور جمیل عورتیں پانی بھر سکتی تھیں۔ ان کے سرو آسا قد، غنچوں کی طرح رنگین لب، اور سنبل پُر پیچاں کے مانند بال ایسے تھے جنہیں دیکھ کر بڑے بڑے باجبروت بادشاہ بھی ایک دفعہ تو ان کے قدموں پر سر رکھ دیتے ان کے معمولی کپڑوں میں سے ان کے جسموں کی رعنائیاں پھوٹ پھوٹ کر ظاہر ہو رہی تھیں۔ ان کے سینوں کے ابھار کسی ایسے ثمر نورس کی یاد دلاتے تھے۔ جسے دیکھتے ہی انسان کے منہ میں پانی بھر آئے۔ ان کے ارغوانی لب انار کی کلیوں کی طرح سرخ سرخ تھے۔ اور ان کی دلفریب رانیں جو ان کی پھٹی ہوئی لپشوازوں میں سے دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ سنگ مرمر کے

کسی دو سفید و براق ستونوں کی یاد دلاتی تھیں۔ جو حریم عصمت کی محراب کو اٹھائے ہوئے ہوں۔

وہ دونوں لڑکیاں اپنے نازک پاؤں اٹھاتی ہوئیں جن میں انہوں نے گھر کی بنی ہوئی معمولی چپلیں پہنی ہوئی تھیں۔ اس چشمے کے قریب آئیں۔ اور اپنے سروں سے مٹی کے مرتبان اتار کر چشمے کے قریب ایک سبزہ زار پر بیٹھ گئیں۔ بڑی لڑکی جس کی عمر پندرہ برس کی ہوگی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ گویا یہ دیکھ رہی ہے۔ کہ کوئی غیر تو اس جگہ نہیں۔ پھر اس نے چھوٹی لڑکی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ جس کا نام "تائیس" تھا۔ "تائیس نے بڑی لڑکی کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اور پھر وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ بڑی لڑکی جس کا نام "بختر" تھا۔ اس سے کہنے لگی۔

"تائیس نہ جانے مجھے کیا ہوگیا ہے۔ جب تک دن میں تجھے ایک بار نہ دیکھ لوں مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

تائیس نے جواب دیا۔ "اور بختر میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی جب تک تجھے ایک نظر نہ دیکھ لوں۔ مجھے چین ہی نہیں آتا۔"

بختر نے جواب دیا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے سینے میں ایک آگ سی لگی ہے۔ جو کسی صورت نہیں بجھ سکتی۔ چاہے میں کتنی ہی کوشش کیوں نہ کروں۔"

تائیس نے جواب دیا۔ "اور میری بھی یہی کیفیت ہے۔ کاش کہ ہم دونوں مختلف ہوتیں۔"

بڑی لڑکی نے تائیس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ اور اس نے اپنی بانہہ تائیس کے گلے میں ڈال دی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔ "سچ کہو تائیس! تم نے مجھ پر کیا جادو کر دیا ہے۔ جو دل مضطرب کو تمہارے بغیر

ایک پل بھی قرار نہیں آتا؟"

تائیس نے جواب دیا۔"بخترا میں اس کا کیا جواب دوں؟ کیونکہ میں خود یہ سوال تم سے کر سکتی ہوں؟"

پھر اس نے بھی اپنی بانہہ "بختر" کے گلے میں ڈال دی۔ جو نور کے سانچے میں ڈھلا ہؤا تھا۔ اور وہ دونوں اس طرح کہ ایک کی بانہہ دوسری کے گلے میں تھی۔ وہاں کتنا ہی عرصہ محویت کے عالم میں بیٹھی رہیں۔ اس وقت دونوں ایسی خاموش تھیں۔ گویا انہوں نے ابھی ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ اور ہمیشہ سے خاموش چلی آتی ہیں۔ مگر اس خاموشی کے عالم میں بھی ایک شے ایسی تھی۔ جو پکار پکار کر اس اندرونی ہیجان کا پتہ دیتی تھی۔ جو اس وقت ان کے دل و دماغ میں جاری وساری تھا۔ اور وہ ان کے سینوں کا اتار چڑھاؤ تھا۔ جو بتدریج بڑھتا اور گھٹتا تھا۔ اور ان کے سانس لینے کی آواز تھی۔ جس کی آمد و رفت کی ہلکی ہلکی آواز ان کے دلی تلاطم کی آئینہ دار تھی۔ پھر دونوں کے سرخ ارغوانی لب ایک دوسری کے لبوں سے مل گئے۔ اور دونوں ایک دوسری کے لبوں سے ارغوانی رنگ چرانے لگیں۔ لیکن انہوں نے اسی پر بس نہیں کی۔ لبوں سے ہٹ کر انہوں نے ایک دوسری کے تمتماتے ہوئے رخساروں کے بوسے لینے شروع کر دیئے۔ بوسوں سے ہٹ کر ان کے جنون نے اپنی تسلی کے لئے ایک اور نئی راہ نکالی۔ انہوں نے ایک دوسری کے جسم سے اپنے جسم کو ملنا شروع کیا۔ اور خوب زور سے ایک دوسری کو بھینچنے لگیں۔ اس وقت ان کی آنکھیں انگاروں کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ اور ان کا سانس کسی ایسے آدمی کی طرح پھول رہا تھا۔ جو لگاتار کئی میل دوڑنے کے بعد یکایک ایک جگہ ٹھہر گیا ہو۔

آخر اپنے جذبۂ بے اختیار کی تسکین نہ پا کر انہوں نے ایک دوسری کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اور الگ الگ ہو گئیں۔ تھوڑے سے عرصہ بعد جب ان کے ہیجان کا تلاطم

کسی قدر کم ہوا۔ تو بڑی لڑکی کہنے لگی۔

"آہ! ہم اپنے سینوں کی آگ کبھی نہ بجھا سکیں گی"

"بجھا کیوں نہ سکو گی؟ ——"

اس آواز نے ان کو چونکا دیا۔ اور وہ درختوں کے کنجوں کی سمت دیکھنے لگیں۔ سوکھے ہوئے پتوں کے پاؤں سے مسلنے کی آواز کے ساتھ ساتھ ایک اجنبی ان کی طرف بڑھتا ہوا چلا آرہا تھا۔ جس کا لباس ظاہر کرتا تھا۔ کہ وہ کوئی معمولی آدمی نہیں بلکہ کوئی سردار ہے۔ اس کے پہلو میں ایک تلوار لٹک رہی تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک کمان تھی۔ اس اجنبی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ اتنی خوفزدہ ہوگئیں۔ کہ ان میں سے ایک کی تو چیخ ہی نکل گئی۔

"خوبصورت یونانی دوشیزاؤ! ڈرو مت۔ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ ان کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ لیکن وہ اسی طرح سہمی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں۔ کہ وہاں سے اٹھ کر بھاگ جائیں۔ کہ اجنبی نے انہیں درشتی سے بیٹھ جانے کے لئے کہا۔ اور وہ ڈرتے ڈرتے پھر بیٹھ گئیں۔

یہ نو وارد اجنبی گزدار تھا۔ جو شاہیپ کی بستی کا سردار تھا۔ اس دن کی بےعزتی کے بعد جوان لڑکیوں کے قبیلے کے ایک سرکردہ رکن نے کی تھی۔ نوجوان سردار گزدار اس بات کا منتظر رہتا تھا۔ کہ کوئی موقع ہاتھ آئے۔ اور وہ اس قبیلے سے اپنی بےعزتی کا انتقام لے تاکہ اس کے انتقام کی آگ کسی طرح سرد ہو —— آج اتفاق سے وہ شکار کھیلتا ہوا اس طرف آنکلا تھا۔ کہ اس نے درختوں میں سے ان دونوں لڑکیوں کو باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ دبے پاؤں ان کی باتیں سننے کے لئے درختوں کے کنج میں چھپ گیا تھا۔

آخر گزدار کہنے لگا۔ "تم کو معلوم ہے۔ کہ تمہارے قبیلے کے ایک فرد نے میری

زبردست توہین کی تھی۔ جس کا بدلہ لینا میری زندگی کا اولین مقصد ہے۔ بتاؤ کہ کیا بدلہ لینے کا وقت نہیں ہے۔

پھر اس نے سہمی ہوئی لڑکیوں کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ جو اب مارے ڈر کے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ مگر اس نے ان کی خوفزدگی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ اور پھر اس نے کمر سے تلوار نکال لی اور کہا کہ "مجھے اپنے انتقام کی قسم، اگر تم دونوں نے ذرا بھی میرے حکم کی نافرمانی کی۔ تو اس تلوار سے جس کی تشنگی انتقام ایک ہزار یونانیوں کا خون پی کر بھی نہ بجھے گی۔ تم دونوں کو تہ تیغ کر دوں گا۔ آؤ میرے پیچھے پیچھے!"

لڑکیاں ڈرتے ڈرتے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں۔ وہ انہیں ایک گھنے درختوں کے ایک نہایت تاریک جھنڈ میں لے گیا۔ جہاں آدم زاد تو ایک طرف کوئی پرندہ بھی دم نہ مارتا تھا۔ رات کی سیاہی دم بدم پھیلتی جاتی تھی۔ اور رات کا سکوت اور بھی زیادہ گہرا ہو رہا تھا۔ اس نے کرخت لہجے میں کہا۔ "بس یہاں ٹھہر جاؤ۔"

لڑکیوں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ اور ٹھہر گئیں۔ پھر اس نے بڑی لڑکی کو کہا۔ کہ تم یہیں ٹھہرو۔ اور خود چھوٹی لڑکی کو جس کا نام تائیس تھا لے کر کنج کے اندر چلا گیا۔ بڑی لڑکی نے کنج کے اندر سے ہلکی ہلکی چیخوں، رونے اور التجاؤں کی آوازیں سنیں۔ اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر بعد جب چھوٹی لڑکی کنج سے باہر آئی۔ تو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ اس کا خزینۂ عصمت کسی نے بُری طرح لوٹ لیا ہے۔

اس کے بعد اس سردار نے بڑی لڑکی سے بھی یہی سلوک کیا۔ اور جب دونوں کے جسموں سے اس نے شربتِ وصل پی کر اپنی آتشِ انتقام کو فرو کر لیا۔ تو ان سے "ایک ایرانی سردار کی توہین کا بدلہ" کہتے ہوئے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جو پاس ہی ایک جگہ گھاس چر رہا تھا —— دریا کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر پل بھر میں نظروں سے غائب ہو گیا۔

(۴)

دوسرے دن تائیس کے قبیلے کے تمام افراد سبک رفتار گھوڑوں پر سوار ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے گزدار کی بستی پر ٹوٹ پڑے۔ اور اس کے بہت سے آدمیوں کو قتل کر دیا۔ لیکن چونکہ گزدار اس علاقے میں سب سے زیادہ بارسوخ سردار تھا اس لئے دوپہر ہوتے ہوتے اس کی امداد کے لئے اردگرد کی دیگر بستیوں کے سرداروں کی طرف سے کمک پہنچ گئی۔ اور انہوں نے تائیس کے قبیلے کے ہر فرد کو اپنی تلواروں کی دھار پر رکھ لیا۔ اور بچہ، بوڑھا، جوان کوئی ان کے انتقام سے نہ بچ سکا۔ شام ہوتے ہوتے اس قبیلے کے تمام خیموں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا گیا۔ اور اس قبیلے کی تمام عورتوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان میں سے کچھ جوان اور خوبرو عورتیں تو گزدار کے قبیلہ والوں نے اپنی آتش ہوس فرو کرنے کے لئے رکھ لیں۔ اور باقی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ایک یونانی سوداگر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

اس افراتفری میں تائیس اور بختر دونوں سہیلیاں بھی اپنی دیگر رشتہ دار عورتوں سے بچھڑ گئیں۔ اور اس یونانی سوداگر کے ہاتھ بیچ دی گئیں۔ اس یونانی سوداگر نے ان سب کو بھیڑ بکریوں کے ایک ریوڑ کی طرح ہانک کر ایک بڑی سی کشتی میں سوار کرایا۔ اور انہیں مختلف ملکوں میں بیچتا ہوا یونان کو روانہ ہو گیا۔ جب یونان پہنچا۔ تو تمام عورتیں بک چکی تھیں۔ لیکن ابھی بختر اور تائیس فروخت نہ ہو سکی تھیں۔ کیونکہ وہ یونانی سوداگر ان کی بے مثال خوبصورتی کی وجہ سے خریداروں سے اتنی زیادہ قیمت مانگتا تھا۔ کہ کوئی شخص دینے پر رضامند نہ ہوتا تھا۔

ایک دن وہ ایتھنز کے بازار میں ان دونوں کو بغرض فروخت لئے کھڑا تھا کہ ایک ارمنی رئیس نے بختر کو منہ بولی قیمت دے کر خرید لیا۔ اور اب سوداگر کے پاس صرف تائیس ہی رہ گئی تھی۔ لیکن اس کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ کوئی شخص اسے خرید نہ سکتا تھا۔ آخر جب

وہ مایوس ہو کر شام کے وقت تائیس کو واپس گھر لئے جا رہا تھا۔ تو ایک یونانی طوائف نے جس کا نام ازکوبی تھا اسے خرید لیا۔ دراصل ازکوبی کی جوہر شناس نگاہوں نے اس چیز کو پرکھ لیا تھا۔ اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ تائیس کا حسن کوئی معمولی حسن نہیں ہے۔ وہ بادشاہوں کے درباروں کی زینت کے لئے بنائی گئی ہے۔

گھر لا کر ازکوبی نے تائیس کو موٹے جھوٹے کپڑوں کی بجائے جو اس کی غلامی کے ساز دار تھے ——— نہایت نفیس زرق برق لباس پہنایا۔ اور اپنی کنیزوں سے جو اس کی آرائش جمال کیا کرتی تھیں۔ کہا کہ اسے اسی طرح آراستہ و پیراستہ کرو جس طرح مجھے کیا کرتی ہو۔ چنانچہ اپنی مالکہ کے حکم کی تعمیل میں ان کنیزوں نے تائیس کو سنوارنے میں اس کاریگری سے کام لیا۔ کہ جب اس نے اپنا سراپا ایک قدِ آدم آئینے میں دیکھا۔ تو وہ خود کو بھی پہچان نہ سکی۔ اس کے اصلی حسن کی خوبیاں مصنوعی آرائش سے دہ چند ہو رہی تھیں۔ اس کے بالوں میں نہایت عمدہ خوشبودار تیل ڈال کر انہیں اس طرح پیچ در پیچ بنایا گیا تھا۔ کہ دیکھنے والوں کا دل ان کی "پیچدار گیسوں" میں الجھ کر رہ جاتا۔ کنیزوں نے مزید ستم یہ کیا کہ اس کے سر کے دونوں طرف گلاب کے دو نہایت خوبصورت پھول جن کا شوخ رنگ اس کے لبوں کی سرخی کے مانند تھا۔ لگا دیئے۔ اور اس کے سینے کے ابھار کو اور زیادہ نمایاں کرنے کے لئے انہوں نے اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیض کے اوپر ایک ایسا سنہرا پٹکا باندھ دیا۔ جس میں دونوں طرف دو خوبصورت طلائی پھول کڑھے ہوئے تھے اور یہ پھول بیچ میں سے خالی تھے۔ لیکن باہر سے ابھرے ہوئے معلوم دیتے تھے اور جب اس کے سینے کے اوپر یہ پٹکا کس کر باندھ دیا گیا۔ تو اس کے اثمار شباب جنگلی دلفریب رعنائیاں دیکھنے والوں کو ہمیشہ کے لئے مفتون بنانے کے لئے کافی تھیں۔ بہت زیادہ ابھر آئے۔ اور جب وہ ازکوبی کے عظیم الشان گھر میں چلتی۔ تو اس کے دل کی ہر دھڑکن اور قدم کی ہر جنبش کے ساتھ ان میں ایک ایسی لرزش پیدا ہوتی جو بے

دیکھنے والوں کے دل کی کائنات میں ایک زلزلہ سا بپا ہو جاتا۔ اور وہ کم از کم ایک لمحہ کے لئے تو زیر و زبر ہو جاتی۔ الغرض اس کو بنا سنوار کر کنیزیں اپنی مالکہ کے سامنے لے گئیں جب اڈکوبی نے اس کو اس حالت میں دیکھا۔ تو بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ کہ "ارے یہ تم میرے پاس کسی آسمانی دیوی کو لے آئی ہو؟"

وہ محویت کے عالم میں اس کو ٹکٹکی باندھے کافی عرصے تک دیکھتی رہی۔ اور پھر یکبارگی اس سے دوڑ کر لپٹ گئی۔ اور اس کے منہ کو چوم لیا۔ تائیس شرما گئی۔ اور اس کے رخسار شرم سے تمتما گئے۔ پھر اڈکوبی اس سے کہنے لگی: "اے دوشیزہ! یہ گھر اب تیرا ہے۔ اور جس قسم کی زندگی میں بسر کرتی ہوں۔ اس قسم کی زندگی اب تجھے بھی گزارنی ہو گی"۔

اس کے بعد اڈکوبی نے تائیس کو وہ تمام طوائفوں والے اسرار سکھانے شروع کئے جن کی امداد سے تائیس کو ہر امیر و ذی حشمت کا دل مٹھی میں کرنا تھا۔ اڈکوبی نے اس کو عشوہ گری کے تمام پہلوؤں سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں کل فن تائیس عشوہ گری اور ناز آفرینی میں اپنا کوئی جواب نہ رکھتی تھی۔ اس کی ناز آفرینیوں سے بڑے بڑے امراء و وزراء اور فوجی افسروں کے دل پہلو سے نکل کر بے اختیار اس کی طرف کھنچے چلے آتے۔ تھوڑے ہی عرصے میں یونان کی کوئی ایسی طوائف نہ تھی جو حسن و جمال، عشوہ گری اور ناز آفرینی میں اس کا مقابلہ کر سکے۔

تائیس کی یہ شان تھی۔ کہ اس کے گھر میں ہمیشہ یونان کے مشہور ترین فوجی جرنیل بڑے بڑے علماء اور دیگر رؤسا حاضر رہتے۔ اور اس کی صحبت سے جو پھولوں سے بھی زیادہ رنگین اور شراب ارغوانی کے نشے سے بھی زیادہ سرور انگیز تھی۔ لذت یاب رہتے۔

یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ سکندر اعظم کا باپ فیلقوس مر چکا تھا۔ اور تمام مقدونیہ اس کے زیر نگیں تھا۔ سکندر اعظم کے دل میں جہاں دنیا کو فتح کرنے کا خیال سمایا ہوا تھا۔ وہاں ایک گوشے میں یونان کی روایات کی پیروی کرتے ہوئے عیش و عشرت اور طربناکی

نے بھی گھر کیا ہوا تھا۔ چنانچہ امراء اور وزراء اس کو خوش کرنے کے لئے اکثر اوقات حسین و حور کنیزیں اور دیگر عورتیں پیش کیا کرتے تھے۔ انہی دنوں تائیس کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ ہوتے ہوتے اس کے حسن کی شہرت مقدونیہ کے دربار میں بھی پہنچی۔ نوجوان سکندر کا ایک اشارہ ہی کافی تھا۔ اور تائیس جو اس سے پہلے ہر کس و ناکس کی آغوش کی زینت تھی۔ اب ایک بادشاہ کے پہلو میں آگئی۔

سکندر اعظم کو اس نے اپنی دلفریب اداؤں سے ایسا فریفتہ کر لیا۔ کہ وہ اس کے بغیر ایک لمحہ بھی نہ گزار سکتا تھا۔ سفر و حضر، رزم و بزم میں بھی اس کو اپنے ہمراہ رکھتا۔ رات اس کی دیوانہ وار پرستش کرتا۔ لیکن تائیس اس سے کبھی التفات سے پیش نہ آتی۔ کا غرور حسن، اس کی التجاؤں کو نیازمندی کی درگاہ میں پہنچنے ہی نہ دیتا۔ سکندر بہت کوشش کرتا۔ کہ اس کے حسن سے اپنے دل کی پیاس بجھائے۔ مگر تائیس اس کی یہ کبھی پوری نہ ہونے دیتی۔ ہمیشہ اُسے کسی نہ کسی بہانے سے ٹال دیتی۔ سکندر اس بے اعتنائی سے دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھاتا۔ مگر بظاہر کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ عشوہ گر حسینہ نے اس کو اپنی عشوہ گریوں سے کچھ اس طرح مطیع کیا تھا۔ جس طرح جادوگر کسی وحشی درندے کو رام کر لیتا ہے۔ سکندر بھی جواب میں اس سے بے اعتنائی برتنے کی کوشش کرتا۔ لیکن کب تک؟ آخر چند روز کی بے اعتنائی کے بعد وہ پھر اس کی بارگاہِ حسن میں جا پہنچتا۔ تائیس اس کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکراتی۔ اور اس وارفتگی پر ہنس دیتی۔

(۵)
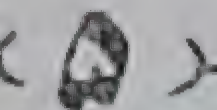
ایک دن جب کہ تائیس اپنے کمرے میں ایک مخملیں صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سکندر اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے اس وقت ایک عزم راسخ کا اظہار ہو رہا تھا۔ گویا وہ کوئی بڑا ارادہ کرنے والا ہے۔ اس نے آتے ہی تائیس سے کہا

"تائیس میں ایرانی بادشاہ دارا کی سرکوبی کے لیے جا رہا ہوں۔ میری تمام سپاہ تیار ہے اور صرف کوچ کے نقارے پر چوٹ پڑنے کا انتظار ہے۔ اس حالت میں میں نہیں چاہتا۔ کہ میں اکیلا اتنا عرصہ رہوں۔ اس لئے میں نے ارادہ کر لیا ہے۔ کہ جہاں جہاں میں جاؤں گا۔ تمہیں بھی اپنے ساتھ رکھوں گا۔ کہو تم بھی میرے ساتھ جانے پر راضی ہو؟"

تائیس نے جواب دیا۔ "بیشک اگر آپ دارائے ایران کی سرکوبی کے لئے جا رہے ہیں۔ تو میں بسر و چشم حاضر ہوں۔ کیونکہ مجھے ایرانیوں کی ذلت دیکھنی مقصود ہے"۔

اور یہ کہتے کہتے اس کی آنکھوں سے آج سے پندرہ سال پہلے کا ایک واضح تصور سامنے آ گیا۔ جب کہ ایرانی فوجیں اس کے قبیلے کو تہ تیغ کر رہی تھیں۔ مرد۔ بچے۔ بڈھے ایران سب چن چن کر قتل کئے جا رہے تھے۔ اور شام کے وقت اس کے قبیلے کے خیموں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ اس نے تصور ہی تصور میں وہ منظر بھی دیکھ لیا۔ جب کہ ایک ایرانی سردار نے اس کا آبگینۂ عصمت درختوں کے ایک کنج میں اپنے غصے اور انتقام کی آگ کو فرو کرنے کے لئے چور چور کر دیا تھا۔ اس کا سارا بدن ایک جوش کے ساتھ کانپنے لگا۔ اس کا چہرہ پکے ہوئے سیب کی طرح تمتا گیا۔ اور اس کی آنکھوں سے شعلے برسنے لگے۔ اس کے کانوں میں کوئی پُرجوش آواز میں کہہ رہا تھا۔ "انتقام! انتقام!"

سکندر نے خاموشی کی مہر کو توڑتے ہوئے کہا۔ "تو اچھا! فوراً روانگی کی تیاریاں کرو۔ ہمیں آج رات ہی یہاں سے کوچ کرنا ہے"۔

مختصر سی تیاریوں کے بعد تائیس سفر پر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس نے اپنے ساتھ وہی دو کنیزوں کو بھی لے لیا۔ جو مشاطہ گری میں مہارت کامل رکھتی تھیں۔ اور اپنی پوری رعنائیوں اور جلوہ ریزیوں کے ساتھ سکندر کے ہمراہ ایران کی طرف روانہ ہو گئی۔

---- (۱۱) ----

سکندر اپنی فوجِ ظفر موج کے ساتھ دارا کی سپاہ کو شکستوں پر شکستیں دیتا ہوا ایران

کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ اس نے دارا کو اربیل اور شام میں ایسی زبردست شکستیں دی تھیں کہ وہ خود بھی مایوس ہو گیا۔ اور اس کی فوج بھی ہمت ہار بیٹھی۔ اور اس کی وسیع سلطنت میں ہر طرف بدامنی اور شورش پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے اعیانِ سلطنت اس کی ہلاکت کے درپے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کوئی موقع ملے۔ تو اسے قتل کر دیں۔ اس کے ہاتھوں سے شام اور عراق جیسے ملک نکل چکے تھے۔ اور اب اُسے معلوم ہو گیا تھا۔ کہ پارس، ہمدان اور شستر پر بھی تھوڑے عرصہ کے بعد سکندر کا قبضہ ہو جائے گا۔

سکندر نے اربیل میں دارا کو شکست دے کر جہاں کی دولت اپنے قبضے میں لی اور اسے اپنے لشکریوں میں جی کھول کر تقسیم کیا۔ اور پھر شوستر پر حملہ کرنے کے ارادہ سے کوچ کیا۔ چند ہی دنوں میں اس نے شوستر کو بھی فتح کر لیا۔ اور اربیل کی طرح اس نے وہاں کے خزانے کو بھی لوٹا۔ اور اپنے سپاہیوں میں تقسیم کیا۔ پھر اس نے پارس کی طرف پیش قدمی کی۔ یہاں ایک فیصلہ کن جنگ میں یونانیوں نے ہمیشہ کے لئے ایرانی سلطنت کو کمزور کر دیا۔

ان پے در پے فتوحات نے سکندر پر اپنی عظمت کا نشہ طاری کر دیا۔ اور اس نے جی کھول کر بد عنوانیاں کیں۔ اور جی بھر کے شرابیں پئیں۔ حسین و جمیل ایرانی عورتوں کے جسموں سے لذت یاب ہوا۔ ہر روز اس کے پہلو میں ایک نئی ایرانی عورت ہوتی۔ پھر بھی اس کی اصلی آتشِ ہوس فرو نہ ہوتی تھی۔ ایک رات اس نے ایرانیوں کے قصر میں جشنِ طرب منعقد کیا۔ اس جشن میں ایرانی لونڈیاں رقص کرنے کے لئے بلائی گئیں۔ یونانی سازندے اور مغنی سکندر کی فتوحات کا ذکر گا گا کر سنانے لگے۔ قصر میں ہر طرف عیش و طرب کا سماں طاری ہو گیا۔ امیر، وزیر اس کے حلقہ میں بیٹھے تھے۔ اس کے پہلو میں اس کے دل کی ملکہ، اس کی کافر ادا تائیس ایک سہ پہری ہو کر بیٹھی تھی۔

مانند جیتی تھی۔ آج اس نے اپنے آپ کو سنوارنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں
تھا۔ اور اپنا سب سے خوش نما لباس پہنے ہوئے تھی۔ جس میں سے اس کے
کی رعنائیاں اور تجلیاں چھپ کر ظاہر ہو رہی تھیں۔ اس کے بالوں میں دو
سن کے پھول گندھے ہوئے تھے۔ اور اس کے سینے پر قیمتی موتیوں کی ایک مالا
تھی۔ سکندر اسے اس لباس میں دیکھ کر از خود رفتہ ہو گیا۔ اور اس نے اپنے ان
دل اور وزیروں کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ جو اس کے گرد بیٹھے ہوئے شراب ارغوانی کے
چڑھا رہے تھے۔ اور شراب کے نشے میں بد مست ہو کر گر پڑتے تھے۔ اس نے تائیس
کو گود میں اٹھا لیا۔ اور پے در پے اس کے دو تین بوسے لے لیے۔ تائیس نے غصے
اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اور اس کی گرفت سے ایک مچھلی کی طرح تڑپتی ہوئی نکل کر
بچھے ہوئے گدیلوں پر گر گئی۔ سکندر نے جذبات کے نشے میں چور ہو کر ایک بار
اس کی طرف بڑھنا چاہا۔ لیکن اس نے سکندر کو اپنے ہاتھ کے اشارے سے تحکمانہ
میں وہیں روک دیا۔ اور کہا "اس قدر کیوں وارفتہ ہوئے جا رہے ہو؟"
سکندر نے شراب کے نشے میں چور ہو کر جواب دیا "مجھے آج کسی کی کوئی پروا
نہیں۔ تم آؤ میرے پہلو میں بیٹھو!"
لیکن تائیس نے جواب دیا "میں تخلیہ چاہتی ہوں" جس پر سکندر نے جواب دیا۔
یہ کون سا مشکل ہے۔ اور پھر اس نے حکم دیا کہ سب لوگ باہر چلے جائیں۔ محل میں
متنفس بھی نہ رہے۔ امیر وزیر اور دیگر سپاہی شراب کے نشے میں چور لڑکھڑاتے
ئے محل سے باہر نکلنے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصے میں یہ قصر بالکل خالی ہو گیا۔ اور
میں صرف تائیس اور سکندر ہی رہ گئے۔
اب وہ موقعہ تھا۔ جس کا تائیس کو مدتوں سے انتظار تھا۔ اس نے سکندر کو اب
تمام کافرادائیوں سے مسحور کرنا شروع کر دیا۔ وہ پلنگ کے اوپر بیٹھ گئی۔ اس نے

اپنے سینے کا لباس درست کیا۔ لیکن اس طرح کہ اس کا آدھا سینہ سکندر کے دلِ مضطرب کو دعوتِ نظارہ دے کر اور زیادہ گھائل کرنے لگا۔ سکندر کو بھلا اب تاب کہاں تھی۔ مدتوں کے بعد یہ موقعہ ملا تھا۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو تائیس کے پلنگ پر گرا دیا۔ اور تائیس کی گردن میں اپنے دونوں بازو حمائل کر کے پے در پے اس کا منہ چومنے لگا۔ اس نے تائیس کے رخساروں، لبوں، ماتھے، آنکھوں اور گردن پر بوسوں کا ایک تار باندھ دیا۔ ادھر تائیس تھی۔ کہ اس کے دیوزاد جسم سے ایک نازک بیل کی طرح چمٹی جاتی تھی۔ اس وقت سکندر وہ سکندر نہ رہا تھا۔ جو ایک فاتح تھا۔ بلکہ جذبات سے مغلوب ایک معمولی انسان تھا۔ اس نے تائیس کو اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ اور ادھر تائیس نے بھی اپنے جسم کو اس کے جسم سے کچھ اس طرح وابستہ کر دیا۔ کہ دونوں کے دلوں کے دھڑکنے کی صدا دونوں سُن رہے تھے۔

اور اس وقت جب کہ جذبات کا طوفان اپنی پوری شدت پر پہنچ گیا تھا۔ تو تائیس نے سکندر سے کہا۔ "بڑے آئے محبت جتانے والے۔ تم نے ابھی تک میرے لئے کیا ہی کیا ہے؟"

سکندر نے جواب دیا۔ "میرا جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ تمہارے ایک اشارے سے ادھر کی دنیا اُدھر کر دوں گا!"

اس پر تائیس نے کہا۔ "میری ایک آرزو ہے۔ اور وہ یہ کہ میں خشیارش کے بنائے ہوئے ان خوبصورت ایوانوں کو آگ کی لپٹوں میں نہاتے ہوئے دیکھوں"

سکندر نے جواب دیا۔ "واہ! یہ بھی کوئی بات ہے"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے حکم دے دیا۔ کہ خشیارش کے تمام خوبصورت ایوانوں کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا جائے۔ حکم کی دیر تھی چشم زدن میں تمام شاہانِ عجم کی سینکڑوں سالوں کی دولت ایک عورت کی خوشی پر قربان کر دی گئی۔

خشیارش کے خوبصورت ایوانوں کو آگ لگا دی گئی۔ اور وہ رات بھر میں راکھ کا ڈھیر بن گئے۔

لیکن تائیس کے انتقام کی آگ ابھی نہ بجھی تھی۔ اس نے سکندر سے کہا "میری پیاس ابھی نہیں بجھی۔ میں چاہتی ہوں۔ کہ جتنے ایرانی قیدی ہیں سب کے سب تہ تیغ کر دیئے جائیں"

سکندر نے ایک اشارہ کیا۔ اور پل بھر میں سینکڑوں ایرانی سپاہیوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپنے لگیں۔

تائیس نے پھر کہا "میں چاہتی ہوں۔ کہ ان لاشوں کا روئے زمین پر کوئی نشان تک باقی نہ رہے"

سکندر نے کہا "یہ کونسی مشکل بات ہے" اس نے پھر حکم دیا کہ "ان مقتولین کی لاشوں کو خشیارش کے جلتے ہوئے ایوانوں میں پھینک دو۔ تاکہ ایوانوں کے ساتھ یہ بھی جل کر راکھ ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اور ان لاشوں کو جلتے ہوئے ایوانوں میں پھینک دیا گیا۔ اور جب صبح ہوئی تو نہ خشیارش کے مکانوں کا وہاں کوئی نشان باقی رہا تھا۔ اور نہ ان ایرانی سپاہیوں کا۔

سکندر نے ایک عورت کی خوشی پر ان سب کو بھینٹ چڑھا دیا تھا۔

میڈم کیوری کا افسانۂ محبت

ذیل میں دنیا کی سب سے بڑی سائنسدان خاتون میڈم میری کیوری کی محبت شادی اور ازدواجی زندگی کے حالات مختصر طور پر درج کئے جاتے ہیں۔ میڈم کیوری وہ مشہور و معروف سائنسدان خاتون ہے۔ جس نے ریڈیم دریافت کر کے دنیائے سائنس میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

اس عورت کے افسانۂ محبت نے بلاشبہ پولینڈ کی تاریخ میں چند دلکش ابواب کا اضافہ کر دیا ہے۔

میڈم کیوری کی بیٹی ایو نے اپنی زندہ جاوید ماں کے سوانح حیات قلمبند کئے ہیں جس میں اس نے بتایا ہے۔ کہ کس طرح ۱۸۹۱ء میں پولینڈ کی ایک ۲۴ سالہ غریب لڑکی میری سکلوڈوسکا تعلیم حاصل کرنے کے لئے وارسا سے پیرس پہنچی اور سوربون کے سکول میں داخل ہونے کے لئے اسے کن کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن وہ اپنی غیر معمولی مستقل مزاجی کی وجہ سے تمام مشکلات پر غالب آ گئی۔ اور رفتہ رفتہ اس نے اتنی کامیابی حاصل کر لی۔ کہ اس کا نام شہرت کے آسمان پر چودھویں کے چاند کی طرح چمکنے لگا۔

پیرے کیوری کی عمر پینتیس سال کی تھی۔ اس وقت وہ انتہائی سرگرمی سے سائنس کی ریسرچ میں حصہ لے رہا تھا۔ اس نے اب تک کسی عورت سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن جب وہ میری سے ملا۔ تو اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل نامعلوم طور پر میری کی طرف مائل ہو رہا ہے۔ اس نے چند رسمی باتوں کے بعد میری سے کہا۔

"میں پھر بھی کبھی آپ سے ملنا چاہتا ہوں" میری نے کاغذ کے ایک چھوٹے سے پرزے پر اسے اپنا پتہ لکھ دیا۔

ایک دفعہ پھر میری اور پیرے کیوری کی ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ بظاہر وہ اس سے تپاک سے ملی۔ مگر اس نے پیرے سے بے تکلف ہونا مناسب نہ سمجھا۔ بہت دیر تک وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ دونوں اس ملاقات سے بہت لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اس ملاقات کا نظارہ بہت رومان انگیز تھا۔ ایک مرد ایک تنہا کمرے میں ایک عورت کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی عقیدت مند نگاہیں بار بار میری کے چہرے پر جم جاتی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے جب بھی میری کی نگاہیں اس سے چار ہوتیں تو وہ دیکھتی کہ پیرے کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوتی ہیں۔ لیکن جب بھی وہ اس کی طرف دیکھتی وہ جلدی سے نظریں نیچی کر لیتا۔ اس سادہ سے کمرے میں وہ ایک دلکش تصویر معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا لباس بالکل معمولی اور فرسودہ سا تھا۔ اور چہرہ نہایت درخشاں جبیں سے اس کی تند خوئی کی دلکش جھلک نظر آ رہی تھی۔ غرضیکہ یہ سادہ سا انداز اور چہرے کی خوبصورت درخشنی پیرے کے دل میں کیوپڈ کے نقرئی تیر کی طرح ایک شیریں خلش پیدا کر رہی تھی۔ اس وقت میری اسے یونان کی حسن کی دیوی سے کہیں زیادہ خوبصورت معلوم ہو رہی تھی۔

چند ماہ اسی طرح گزر گئے۔ ان کے دوستانہ تعلقات روز بروز استوار ہوتے گئے۔ دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے خلوص اور انس پیدا ہونے لگا۔ یہ نوخیز عورت جو اب تک انتہائی پارسائی کی زندگی بسر کرتی آئی تھی۔ اور کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے کمرے میں پیرے کی آمد کی منتظر رہنے لگی۔

اگر کسی دن وہ اس سے ملنے نہ آتا۔ تو اس کا دن بہت افسردگی میں بسر ہوتا۔ اور دوسرے دن میری اس کی خوب خبر لیتی۔

اب پیرے اس چاند سے چہرے والی ہونہار اور حد سے زیادہ عقلمند لڑکی کے سنہرے جال میں پوری طرح اسیر ہو چکا تھا۔

جون کی سہ پہر تھی۔ اور یہ لڑکی اپنے "وفادار" انکو جل کے کیمپ پر جانے تیار کر رہی تھی۔ اور پیرے اس سے کہہ رہا تھا۔ کہ "میں کل یہاں نہیں آسکوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام ہے"۔

میری کہنے لگی: "میں اپنے والدین سے تمہارا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔ وہ لنکاسک میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتے ہیں۔ تم کبھی وہاں چلنا۔ وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

اس کے بعد پیرے نے اپنے ماں باپ کے متعلق میری کو کچھ باتیں سنائیں۔ اور میری دلچسپی سے سنتی رہی۔

ایک دن میری کہنے لگی: "میں چند ہفتے تک پولینڈ جا رہی ہوں۔ موسم بہار آنے والا ہے۔ اور اس وقت ہمارا وطن رشکِ جنت بن جاتا ہے۔ میں چھٹیاں وہیں گزاروں گی۔"

پیرے مضطرب ہو کر کہنے لگا: "کیا تم اکتوبر میں واپس آ جاؤ گی۔ مجھ سے وعدہ کرو۔ کہ تم وہیں کی تو نہیں ہو رہو گی؟ اگر تم وہیں رہیں۔ تو تم اپنی علمی سرگرمیاں جاری نہیں رکھ سکو گی۔ تمہارا کوئی حق نہیں۔ کہ اب تم علم سائنس کو خیرباد کہہ دو ...."

یہ مختصر سی تقریر سن کر میری کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس نے صاف صاف سمجھ لیا۔ "کہ تمہارا کوئی حق نہیں۔ کہ تم مجھے تنہا چھوڑ کر چلی جاؤ۔" دونوں چند

سیکنڈ تک خاموش رہے۔ اس کے بعد میری نے اپنی نیلگوں آنکھیں پیرے کی غمزدہ نظروں سے ملاتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ "نہیں میں ضرور واپس آجاؤں گی میرا دل بھی یہی چاہتا ہے"۔

پیرے نے میری سے شادی کی درخواست کی۔ لیکن میری نے اس کا جو جواب دیا۔ وہ کوئی دل خوش کُن نہ تھا۔ وہ اپنے اور پیرے کے تعلقات صرف دوستی تک محدود رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن پیرے کے لئے یہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ وہ اس نوجوان سائنسدان کو مایوس کر کے چلی گئی۔

اکتوبر آگیا۔ پیرے انتہائی بے صبری سے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ میری پیرس پہنچ گئی۔

پیرے پر اب جنون کی کیفیت طاری ہو چکی تھی۔ میری کا روکھا جواب ایک زہریلے نشتر کی طرح دل میں چبھ گیا تھا۔ اور دیوانی محبت کا یہ اثر اب اس کے دل سے پھیلتا ہوا۔ اس کے جسم کی رگ رگ میں سرائیت کر چکا تھا۔ جب میری آئی تو اس نے دیکھا۔ کہ پیرے کی حالت بہت خراب ہے۔ یہ دیکھ کر میری کو بہت افسوس ہوا۔ لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔

پیرے کی مضطرب روح میری کے دل تک پہنچنے کا پوشیدہ راستہ انتہائی سرگرمی سے ڈھونڈتی رہی۔ پیرے نے سائنس کے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کا حل سوچنے میں کبھی اتنی محنت صرف نہ کی ہوگی۔ جتنی محنت اس نے میری کے دل میں گھر کرنے کے لئے صرف کی۔

میری نے تمام حالات سے اپنی بہن کو مطلع کیا۔ اسے پیرے کی حالت پر بہت رحم آیا۔ اور اس نے اپنی بہن کو سمجھایا۔ کہ وہ اپنی ضد سے باز آجائے۔

پیرے ایک دن برونیا سے ملنے گیا۔ اور اس نے اس سے درخواست

تھی۔ کہ وہ اپنی بہن میری کے ہمراہ اس کے والدین کے گھر آنے کی تکلیف کرے اس موقع پر ڈاکٹر کرل کی بیوی نے بھی بیر ڈنیا کو سمجھایا۔ کہ وہ اپنی بہن کو پیرے سے شادی کرنے پر رضامند کرلے۔ وہ کہنے لگی "دنیا میں کوئی ہستی میرے پیرے کی ہمسری کا دعوےٰ نہیں کرسکتی۔ اپنی بہن سے کہو۔ کہ اس سے شادی کرنے میں نہ ہچکچائے۔ وہ کسی اور کی بجائے اس کی بیوی بن کر زیادہ مسرت کی زندگی بسر کرسکے گی"۔ ایک ماہ کی مسلسل کوشش اور اصرار کے بعد میری پیرے سے شادی کرنے پر رضامند ہوگئی۔

۲۶ جولائی کو آخری مرتبہ میری اپنے گھر میں نیند سے بیدار ہوئی۔ یہ دن نہایت عجیب و غریب تھا۔ اس کا چہرہ ایک نامعلوم نور سے چمک اٹھا۔ اس کی سہیلیاں اور دوست اس دن جب اس سے ملے تو حیران رہ گئے۔ ہر کوئی اس سے پوچھ رہا تھا۔ کہ "میری آج تمہارے چہرے پر ایک ایسا نور اور ایسی رونق نظر آرہی ہے۔ جو اس سے پہلے ہم نے کبھی نہیں دیکھی ——— یہ کیا ماجرا ہے؟ سچ بتاؤ ———!"

بات دراصل یہ تھی۔ کہ مس سکلوڈسکا آج میڈم پیرے کیوری بننے والی تھی۔ آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ دونوں اپنی اپنی سائیکل پر سوار ہوکر خوبصورت باغوں کی سڑکوں پر گھوم رہے تھے۔ انہوں نے ایک سبزہ زار میں بیٹھ کر روٹی، پنیر آڑو، چیری وغیرہ کی دعوت اڑائی۔ شام کو وہ ایک سرائے میں چلے گئے۔ اور وہیں رات بسر کی۔ مسرت اور محبت کے ان چند دنوں کے اندر اندر وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے وابستہ کردیئے ——— اب دونوں دل اکٹھے دھڑک رہے تھے ——— دو جسم ایک ہوگئے تھے ——— ——— اور اب سائنس کے پیچیدہ مسائل کا حل پورے انہماک سے ایک نہیں دو

دماغ مل کر سوچنے تھے۔

میری نے اپنا مکان چھوڑ دیا۔ اور میاں بیوی نے اب ایک دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا۔ اس کے تین کمرے تھے۔ انہوں نے اپنے کمروں کو آراستہ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ بلکہ انہوں نے فرنیچر لینے سے بھی انکار کر دیا۔ جو ڈاکٹر کیوری انہیں پیش کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ کہ اگر ہم نے اپنے چھوٹے سے مکان کو فرنیچر سے بھر لیا۔ تو اس کی صفائی میں ان کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہوا کرے گا۔ اس لئے بہتر ہے۔ کہ کمروں کو تقریباً خالی رکھا جائے۔ ایک کمرہ لائبریری کا تھا۔ دوسرے میں ایک بڑی میز اور چند کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ اور تیسرا سونے کے کام آتا تھا۔

اب یہ دونوں مل کر سائنٹیفک ریسرچ میں اپنے مصروف دن گزارنے لگے میری جو آزاد زندگی بسر کر رہی تھی۔ گھر کے کام دھندوں میں بری طرح پھنس گئی اسے کھانا تیار کرنا پڑتا تھا۔ برتن مانجھنے پڑتے تھے۔ اور گھر کی معمولی صفائی میں بھی بہت وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔ لیکن پیرے کی زندگی اتنی مصروف نہیں تھی۔ جتنی اس سائنسدان خاتون کی۔ جو بیک وقت باورچن اور خادمہ کی خدمات بھی بجا رہی تھی۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر مارکیٹ میں چلی جاتی۔ وہاں سے سودا خریدتی۔ اور گھر آکر کھانا تیار کرتی۔ شام کو بھی جب وہ سکول سے واپس آتی۔ تو سبزی، ترکاری اور گوشت وغیرہ مارکیٹ سے خرید لاتی۔ اس بیچاری کو کھانا پکانے کا طریقہ بالکل نہیں آتا تھا۔ اس لئے پہلے پہل اسے کھانا پکانے میں بہت دقت محسوس ہوئی۔ اور شروع میں اس کی پکائی ہوئی چیزیں بہت مضحکہ خیز ہوتیں۔ لیکن جلد ہی وہ کھانا پکانے میں بڑی ماہر ہو گئی۔

سائنٹیفک ریسرچ کے علاوہ اس بیچاری کے وقت کا بہت سا حصہ

گھر کے معمولی کام کاج میں ضائع ہو جاتا۔ لیکن پیرسے کی خاطر وہ یہ سب کچھ اپنا فرض سمجھ کر کرتی۔ ادھر اس کی اطاعت شعاری، محبت اور خلوص کا تو یہ عالم تھا۔ دوسری طرف پیرسے جو بہت ہی مضبوط الحواس تھا۔ اس سے قطعاً ناآشنا تھا۔ کہ وہ اس کی خاطر کتنی زحمت اور کوفت برداشت کرتی ہے۔ اور اس کے قیمتی وقت کا بہت سا حصہ معمولی کام کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔ دن میں آٹھ گھنٹے وہ سائنٹفک ریسرچ میں گزارتی۔ اور کم سے کم تین گھنٹے گھر کے کام کاج میں ضائع ہو جاتے۔

میاں بیوی دونوں اس طرح انتہائی مصروفیت کی زندگی گزارتے رہے۔ ایک سال بعد میری کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اب اس کی مصروفیات پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ لیکن اس نے اپنی سرگرمیوں کو پورے انہماک کے ساتھ جاری رکھا۔ اس نے اور اس کے شوہر نے سائنس کی کون کون سی خدمات انجام دیں۔ یہ ایک علیحدہ طویل داستان ہے۔ اور یہاں اس بارے میں لکھنا شاید موزوں نہیں ہوگا۔ بہرحال میڈم کیوری نے جلد ہی دنیا پر ثابت کر دیا۔ کہ وہ دنیا کی سب سے بڑی سائنسدان خاتون ہے۔

میڈم کیوری اب دنیا میں نہیں۔ لیکن اس کا نام اب تک شہرت کے آسمان پر روشن ستاروں کی طرح لازوال چمک پیدا کر رہا ہے۔

دنیا میں جتنی مشہور عورتوں نے جنم لیا۔ ان میں سے میڈم کیوری ہی ایک ایسی خاتون ہے۔ جس کا اخلاق اس قدر پاکیزہ اور بلند تھا۔

"ایڈگرایلن پو کی محبوبائیں"

ایڈگرایلن پو کے عشق کی داستانیں دوسرے مشاہیر کے عشق کی داستانوں سے کہیں زیادہ دلچسپ اور انوکھی ہیں۔ اس کا مزاج بچپن ہی سے عاشقانہ واقع ہوا تھا۔ چنانچہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" کے مصداق اس نے پندرہ ہی سال کی عمر میں ایک الہڑ دوشیزہ کو لے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔

ایڈگرایلن پو کے مکان کے سامنے ایک بیوہ اور اس کی دو لڑکیاں ایمیل اور سبیل رہتی تھیں۔ اس وقت ایڈگرایلن پو کی عمر پندرہ برس کے قریب تھی۔ ایمیل کی عمر بارہ برس کی تھی۔ اور سبیل کی عمر کوئی اٹھارہ برس کے قریب۔ سبیل ایک حسین وجمیل سنہری بالوں اور نیلگوں آنکھوں والی شوخ اور چنچل حسینہ تھی۔ ایڈگرایلن پو اکثر اس کے گھر جا کر اس سے گھنٹوں باتیں کیا کرتا۔ لیکن نوخیز دوشیزہ کو علم نہ تھا کہ اس چھوٹے سے لڑکے کے دل میں اس کے عشق کی چنگاری سلگ رہی ہے۔ سبیل ایک شوخ چنچل اور سرد مہر لڑکی تھی۔ اور بڑے نوجوان چاہنے والوں کو کسی طرح خاطر میں نہ لاتی تھی۔ بلکہ اکثر ان کی درد بھری التجاؤں کا مضحکہ اڑا دیا کرتی لیکن ایڈگرایلن پو بھی شرارت، مذاق، اور "الہڑپنے" میں اگر اس سے بڑھ کر نہیں۔ تو کم بھی نہ تھا۔

ایک مرتبہ سبیل اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔ کہ ایڈگر بھی کھیلتا کھیلتا کہیں اس طرف آ نکلا۔ اس دن سبیل کی سالگرہ تھی۔ اور وہ بہت خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی۔ ایڈگر نے جب اپنی محبوبہ کو پری بنے ہوئے دیکھا۔ تو ہنس

کر کہنے لگا۔" سبیل مجھے تم سے محبت ہے۔"

سبیل اس کی اس بے تکلفی پر حیران سی رہ گئی۔ لیکن یہ شوخ اور شریر لڑکی جو اپنے بیسیوں چاہنے والوں کا مذاق اڑا چکی تھی۔ بھلا اس چھوٹے سے لڑکے کے چُست فقرے کو سننا کیونکر گوارا کر سکتی تھی۔ چیں بر جبیں ہو کر کہنے لگی "تمہیں مجھ سے محبت ہے؟ مجھ سے محبت ہے؟ ہوں۔ تو پھر جاؤ جہنم میں۔"

بھلا شریر ایڈگر کب ہار ماننے والا تھا۔ سبیل کے پاس آ کر کہنے لگا" میں تمہیں تمہاری سہیلی روزی کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔ لیکن اونچی آواز سے بات نہیں کروں گا۔ تمہارے کان میں ساری بات کہوں گا۔"

سبیل اپنی چہیتی سہیلی کا نام سن کر ہمہ تن گوش ہو گئی۔ اور اس نے ایڈگر کی بات سننے کے لئے اپنا سر ایڈگر کے منہ کے ذرا قریب کر دیا۔ شریر ایڈگر نے پہلے اپنے چاروں طرف ایک نگاہ ڈالی۔ کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ اس کے بعد یکایک وہ مس سبیل کے پھول سے سرخ گال کا ایک شریر بوسہ لے کر ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ اور جاتے ہوئے کہہ گیا۔ کہ "یہ میں نے تمہیں سالگرہ کا تحفہ دیا ہے۔"

سبیل بے چاری حیران و پریشان وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ "ہیں یہ یکایک ہو کیا گیا ہے؟"

سبیل بھلا کس طرح برداشت کر سکتی تھی۔ کہ ایک چھوٹا سا لڑکا یوں اُسے بے وقوف بنا جائے۔ دوسرے دن وہ اسے کسی بہانے سے باغ میں لے گئی۔ اور وہاں جا کر اس کے سامنے بازو پھیلا کر کہنے لگی" پیارے ایڈگر! مجھے تم سے محبت ہے۔ میرا منہ چوم لو۔" ایڈگر بڑے شوق سے اپنی محبوبہ کے لبوں پر مہر محبت ثبت کرنے کو ہی تھا۔ کہ زور سے اس کے منہ پر ایک ایسا چپت پڑا۔ کہ بیچارے کے ہوش پران ہو گئے۔ جب ذرا اس کے ہوش ٹھکانے لگے۔ تو اسے معلوم ہوا کہ سبیل

وہاں سے بھاگ چکی ہے۔

غرضیکہ دونوں میں مدتوں تک اس قسم کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ سبیل نے کبھی ایڈگر کی عاشقانہ باتوں کو اہمیت نہ دی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا۔ کہ وہ ایسی باتیں محض مذاق سے کیا کرتا ہے۔ تاہم ان کی نوک جھونک، شرارتیں اور آپس کی چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔

ایڈگر کے مکان سے کچھ فاصلے پر ایک تاجر کا مکان تھا۔ اس تاجر کی نوخیز لڑکی کو ایڈگر کے چچازاد بھائی سے جو ایڈگر سے دس سال بڑا تھا۔ محبت تھی۔ دونوں کے والدین ان کی باہمی ملاقاتوں پر نکتہ چیں ہوتے۔ تو یہ سنہری چڑیا ایک دن اپنے عاشق کے ساتھ گھر سے اڑ گئی۔ اور دوسرے دن تمام شہر میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ کہ ایڈگر کا چچازاد بھائی رابن پومس گارنی کو اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ان دونوں کی محبت کے متعلق طرح طرح کی سچی جھوٹی داستانیں مشہور ہونے لگیں۔ جب لوگ ان دونوں کے متعلق باتیں کرتے۔ تو ایڈگر بڑے شوق سے سنا کرتا۔

ایک دن اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی اپنی محبوبہ سبیل کو بھگا لے جاؤں۔ لیکن یہ کام بہت مشکل تھا۔ کیونکہ یہ تو صرف سبیل کی رضامندی ہی سے ہو سکتا تھا۔ لیکن سبیل اس کے ساتھ جانے کے لئے قیامت تک رضامند نہ ہو سکتی تھی۔ وہ اس کا مخلص دوست تو ضرور تھا۔ لیکن وہ اسے اپنا عاشق نہیں بنانا چاہتی تھی۔ ایڈگر ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ روز کا ملنا جلنا تو تھا ہی۔ ایڈگر ہر روز شرارت سے اس کے کان میں کہہ جاتا۔ کہ "تم میری بیوی ہو۔ اور میں تم سے شادی کروں گا!" اور سبیل بھی اس کی بات کو ہنسی میں ٹال دیتی۔

یہاں یہ ذکر کر دینا بہت ضروری ہے۔ کہ ایڈگر اپنے ساتھیوں میں بہت ہر دلعزیز تھا۔ تمام لڑکے بن دامول اس کے غلام تھے۔ وہ ہر وقت شرارتیں کرتا رہتا۔ ہنسی اور

دل لگی اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اپنی اسی عادت کی وجہ سے وہ بہت مقبول تھا۔ اور قصبے کے تمام لڑکوں کی فوج کا وہی سردار تھا۔ چنانچہ ایک دن اس نے اپنے پانچ رفیقوں کو جن میں سے اکثر عمر میں اس سے بڑے تھے۔ اپنے پاس بلایا۔ اور کہنے لگا کہ "دوستو! اب تک تم میری ہر درخواست کے سامنے سر تسلیم جھکاتے رہے ہو۔ میں بھی ہر مشکل میں تمہارے کام آتا رہا ہوں۔ آج مجھے تم سے ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ تم جانتے ہو کہ رابن ہڈ کو مس گنار بنی سے محبت تھی۔ اور رابن ہڈ اسے بھگا کر لے گیا ہے۔ اور سنا ہے کہ وہ شہر لورل میں دونوں عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دوستو ہم یسوع ناصری کی مقدس قسمیں کھا کر عہد کر چکے ہیں۔ کہ جب ہم میں سے کوئی ایک مشکل میں ہو۔ تو باقی سب دوست اس کی مدد کریں گے۔ آج اپنے اُس قول کو یاد کر لو۔ اور ثابت کر دو۔ کہ تم واقعی مرد ہو۔ اور اپنے وعدوں اور اپنی قسموں کا احترام کرتے ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ میں بھی رابن ہڈ کی طرح سبیل کو بھگا لے جاؤں۔ دوستو! میں گھر سے بہت سا روپیہ چرانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ اگر اس کام میں تم مجھے مدد دو گے۔ تو میں تم سب کو تین تین ڈالر انعام دوں گا۔ دوستو! میں سبیل کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اگر تم نے میری مدد نہ کی۔ تو میرے اور تمہارے تعلقات ہمیشہ کے لئے خراب ہو جائیں گے۔ کل سبیل کی ماں گھر سے باہر جا رہی ہے۔ اور دو تین دن تک واپس آ جائے گی۔ پروگرام یہ ہے۔ کہ اسی دن رات کو میں سبیل کے گھر جا کر اسے اپنے ساتھ بھاگنے پر رضامند کروں۔ اگر وہ رضامند نہ ہو۔ تو میں باہر آ کر تمہیں اطلاع دوں گا۔ باہر گاڑی کھڑی کر دی جائیگی۔ ہم سب رات کے بارہ بجے کے قریب سبیل کو اس کے بستر سے زبردستی اٹھا کر باہر گاڑی میں لا ڈالیں گے۔ اور پھر میں گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دوں گا۔ اور اپنی سبیل کو اس کے گھر سے ہمیشہ کے لئے نکال لے جاؤں گا۔"

دوسرے دن ایڈگر ایلن پو کے پانچوں دوست اس کے مکان کے بڑے کمرے

میں بیٹھے تھے۔ ایڈگرایلن پو نے ان کی شاندار دعوت کی تھی۔ جسے کھانے کے بعد اب وہ سبیل کے گھر ڈاکہ ڈالنے کے پروگرام پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک واقف درزی کو چھ سیاہ نقاب سینے کا آرڈر دے رکھا تھا۔ اور ان کا ارادہ "حسن آباد" پر نقاب پہن کر ڈاکہ ڈالنے کا تھا۔ ایڈگر نے ایک دن پہلے ہی اپنے نوخیز دوستوں میں تین تین ڈالر تقسیم کر دیئے تھے۔ اور وہ خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ کہ ان کے ہاتھ اتنی "دولت" آگئی ہے۔

دوسرے دن نصف شب کے قریب ایڈگر اپنے پانچوں "ڈاکوؤں" کے ہمراہ اپنی محبوبہ کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سبیل کی ماں تو باہر گئی ہی تھی۔ اتفاق سے نوکرانی بھی اس رات غائب تھی۔ لہذا ایڈگر دیوار پھاند کر اندر جا داخل ہوا۔ تو سبیل اپنے شبستان میں بے خبر سو رہی تھی۔ اس کے کمرے میں ایک لیمپ اب تک روشن تھا۔ ایک کتاب سبیل کے مخملیں گداز اور خوبصورت سینے پر پڑی تھی۔ جسے پڑھتے پڑھتے وہ سو گئی تھی۔ ایڈگر نے آہستہ سے کتاب کو اٹھا کر پرے الماری میں رکھ دیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کیا کیا جائے۔ آخر اس نے کچھ سوچ کر اپنی محبوبہ کا شانہ ہلایا۔ اور اسے جگا دیا۔ وہ اس وقت اسے اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اور کہنے لگی۔ "تم اس وقت یہاں کیوں آئے ہو؟"

ایڈگر کہنے لگا۔ "پیاری سبیل باہر چل کر دیکھو۔ کس قدر خوبصورت چاندنی رات ہے۔ میں باغ میں سیر کر رہا تھا۔ سوچا کہ چلو تمہیں بھی سیر کراؤں۔ بڑی خوبصورت رات ہے۔"

سبیل کہنے لگی۔ "میں نے تم جیسا احمق آدمی کوئی نہیں دیکھا۔ کہ کیا کبھی کسی کو جگا کر بھی سیر کرایا کرتے ہیں۔"

ایڈگر نے جواب دیا۔ "فکر نہیں تمہیں میرے ساتھ سیر کے لئے جانا پڑے گا۔ اگر

نہ جاؤ گی۔ تو میں زبردستی لے جاؤں گا۔"

سبیل نے جواب دیا۔ کہ" دیکھو ایڈگر مجھے اس وقت تنگ نہ کرو۔ اگر تم اس وقت میرے مکان سے چلے نہیں جاؤ گے۔ تو میں یا تو تمہیں دھکے دے کر خود نکال دوں گی۔ یا چابک سے تمہاری مرمت کروں گی۔"

ایڈگر نے سبیل کی کمر میں ہاتھ ڈال لیا۔ اور بوسہ لینے کے لئے جھکا ہی تھا۔ کہ سبیل تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی چارپائی سے نیچے اتر کر اس نے ایک ہنٹر اٹھا لیا۔ اور ایڈگر کو ابھی ایک ہی ہنٹر لگایا تھا۔ کہ وہ بازاری کتے کی طرح چیختا ہوا اس کے کمرے سے بھاگ نکلا۔

صبح کا دروازہ کھول کر وہ باہر نکل آیا۔ اور آکر اپنے دوستوں سے کہنے لگا۔ کہ" دوستو اس چھوکری نے تو مجھے بڑی طرح پیٹا ہے۔ اور بمشکل میں جان بچا کر بھاگا ہوں۔ امید نہیں کہ یہ خوبصورت ہرنی آسانی کے ساتھ ہمارے قابو میں آسکے۔ چلو اب تم لوگ ہی کچھ ہمت کرو۔"

اس کے پانچوں دوست چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے سبیل کے کمرے میں آداخل ہوتے۔ انہیں دیکھتے ہی سبیل کے منہ سے مارے خوف کے زور سے ایک چیخ نکل گئی۔ ان میں سے ایک نے لپک کر سبیل کے منہ پر زور سے پٹی باندھ دی۔ اور باقی سب نے اسے اٹھا لیا۔ وہ اپنے آپ کو ان "غنڈوں" کی گرفت سے بچانے کے لئے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارتی رہی۔ لیکن اس کی کوئی پیش نہ گئی۔ انہوں نے اسے بند گاڑی میں لا ڈالا۔ ان میں سے ایک نے گاڑی کے دروازہ کو تالا لگا کر چابی ایڈگر کے حوالے کر دی۔ ایڈگر نے اپنے زبردست گھوڑے کو زور سے ایک چابک لگایا۔ اور گاڑی ہوا ہو گئی۔

تمام رات اور نصف دن تک یعنی بارہ بجے تک گاڑی چلتی رہی۔ اور اس

عرصہ میں بیچاری سبیل نے جب بھی چلانا چاہا۔ ایڈگر نے اسے چاقو دکھا کر خاموش کر دیا۔
شہر سے باہر نکل کر گاڑی کو ایڈگر کا دوست چلانے لگا۔ اور ایڈگر اپنی محبوبہ کے پاس
بیٹھا۔ دونوں کو اس بارہ گھنٹے کے عرصہ میں خوراک کا ایک لقمہ بھی نہ ملا۔

بارہ بجے کے قریب بند گاڑی ایک گاؤں میں ایڈگر کے ایک آرٹسٹ دوست
کے مکان کے سامنے آ کر رکی۔ سبیل بے چاری نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ اور اس
کی آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ وہ جب ایڈگر سے پوچھتی۔ کہ تم مجھے کہاں لئے جا رہے
ہو۔ وہ کہتا۔ کوئی فکر نہ کرو۔ میں تمہارا دشمن نہیں۔ دوست ہوں۔ ابھی تمہیں
سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔

ایڈگر سبیل کو آرٹسٹ کے مکان میں لے آیا۔ دونوں نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور
ایڈگر اور سبیل بہت دیر تک ایک دوسرے سے جھگڑتے رہے۔ سبیل نے ایڈگر کو
ہزاروں گالیاں دے ڈالیں۔ اسے لاکھ سمجھایا۔ کہ وہ اسے واپس گھر پہنچا آئے۔
لیکن نوخیز عاشق نے سر پر عشق کا بھوت کچھ اس طرح سوار تھا۔ کہ اس نے اپنی محبوبہ
کی ایک نہ مانی۔ اسے زبردستی وہیں اپنے پاس رکھ لیا۔ اس طرح کہ جب وہ باہر جاتا
تو اسے مکان کے اندر کے کمرے میں مقفل کر جاتا۔ اور باہر اپنے دوست کا پہرہ
لگا جاتا۔

سبیل بارہ دن ایڈگر کے پاس رہی۔ اس عرصہ میں ان دونوں کے غائب ہونے پر
ان کے وطن میں کافی سنسنی پھیل چکی تھی۔ آخر ایک دن اتفاق سے ایڈگر کے چچا کے
ایک دوست کا اس گاؤں سے گزر ہوا۔ اور اس نے ایڈگر کو بازار سے گوشت
اور سبزی ترکاری لے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ فوراً اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ ایڈگر
نے اسے نہ دیکھا تھا۔ جب وہ اپنے مکان میں داخل ہوا۔ تو اس شخص نے مکان کی
کھڑکی میں سے جھانک کر اندر دیکھا۔ اندر سبیل بیٹھی کھانا پکا رہی تھی۔ اور اس کا

نوخیز" خاوند" اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس سے مذاق کر رہا تھا۔
اس شخص نے فوراً ایڈگر کے وطن جا کر اس کے چچا کو اطلاع دی۔ کہ تمہارا بھتیجا فلاں گاؤں میں سبیل کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہا ہے۔ ایڈگر کا چچا لمبی لمبی مونچھوں والا ایک گرانڈیل اور تیز و تند مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے فوراً سبیل کی ماں کو ساتھ لیا۔ اور غصے سے بھرا ہوا اس گاؤں کی طرف چل پڑا۔ جس میں ایڈگر اور سبیل "خاوند" اور "بیوی" کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے۔
جب ایڈگر کو پتہ چلا کہ اس کا چچا آ رہا ہے۔ تو وہ اپنے مکان سے بھاگ نکلا۔ لیکن اتفاق سے اسی راستے اس کا چچا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کو کان سے پکڑ لیا۔ اور کہا "بتا تیرا مکان کون سا ہے۔ اور سبیل کدھر ہے؟ ابھی تیری مرمت کرتا ہوں۔"
مرتا کیا نہ کرتا۔ بیچارہ ایڈگر بادل ناخواستہ ان دونوں کو اپنے گھر لے گیا۔ وہاں جا کر پہلے تو ایڈگر کے چچا نے اس کی خوب مرمت کی۔ جب مار مار کر اسے بے ہوش کر دیا۔ تو بے چاری بے قصور سبیل کی شامت آئی۔ اور اس کی ماں نے اسے بڑی طرح پیٹ ڈالا۔ اچھی طرح اس کے بال نوچے گھسوٹے اور تھپڑ لگا کر کہا "تو نے ہمارے خاندان کی لٹیا ڈبو دی ہے" سبیل بیچاری ہزار کہتی رہی کہ "میں اپنی رضامندی سے نہیں آئی۔ ایڈگر مجھے زبردستی اٹھا لایا ہے" لیکن اس کی ماں نے اس کی ایک نہ سنی اور اچھی طرح اس کی مرمت کرتی رہی۔
اب دونوں کو واپس وطن لایا گیا۔ سبیل کی ماں کی تحقیقات سے ثابت ہوا کہ "میاں بیوی" کی حیثیت میں زندگی گزارنے کے باوجود سبیل نے اپنی پاکیزگی نہیں کھوئی تھی۔ یعنی ایڈگر اس وقت اس قدر معصوم تھا کہ اسے جنسی تعلقات کا کچھ علم ہی نہ تھا۔ اس نے اپنی محبوبہ یا "بیوی" کے ہزاروں بوسے تو لے لئے کئی مرتبہ اس

سے ہم آغوش ہُوا۔ اور اسے میری پیاری بیوی کہہ کر پکارتا رہا۔ مگر اس نے ایک مرتبہ بھی
سبیل کی پاکیزگی پر حملہ نہ کیا۔ اسے معلوم ہی نہ تھا۔ کہ بوسوں اور ہم آغوشیوں کے علاوہ
عورت، اور مرد میں کوئی دوسرے تعلقات بھی ہوتے ہیں۔ چنانچہ سبیل جس طرح معصوم
اور پاک آئی تھی۔ اسی طرح معصوم اور پاک واپس آئی "بیاہی" جانے کے باوجود وہ
کنواری تھی۔ اپنے پانزدہ سالہ "خاوند" کی بیوی بن جانے کے باوجود وہ ابھی دوشیزہ
ہی تھی۔

شروع شروع میں تو ایڈ گر اس قدر معصوم تھا۔ لیکن بیس سال کی عمر میں اس کی
یہ تمام معصومیت رخصت ہوگئی۔ اور اس نے اپنی تمام زندگی وقفِ گناہ کرلی۔ یہانتک
کہ اس کی موت بھی گناہ ہی کے ہاتھوں واقع ہوئی۔ ایک صبح کو لوگوں نے دیکھا کہ وہ
شراب پی کر ایک نالی میں گرا پڑا ہے۔ اور اس کی روح پرواز کرچکی ہے۔

(۲)

ایڈ گر ایلن پو نے جب وادیٔ شباب میں قدم رکھا۔ تو سب سے پہلے جس عورت
سے اسے عشق ہُوا۔ وہ خود اس کی بیوہ بھابی مسنر السیتھفر تھی۔ وہ ایک سکول میں
استانی تھی۔ اور اس قدر حسین تھی کہ مرد کیا عورتیں بھی اُسے دیکھ کر انگشتِ حیرت
در دہان ہوجاتی تھیں۔ مسنر السیتھفر کی عمر کوئی بائیس برس کے قریب تھی۔

اس کا سکول گھر سے کوئی نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ اور وہاں بائبل پڑھانے جایا
کرتی تھی۔ سکول اور گھر کا درمیانی راستہ بہت خوبصورت تھا۔ راستے میں جا بجا ہرے
بھرے باغات اور جنگل کا کچھ حصہ تھا۔ جس کے حسن کو ایک صاف شفاف ندی نے
دوبالا کردیا تھا۔ مسنر السیتھفر کے بیوہ ہونے کے بعد ایڈ گر کا اس سے کوئی خاص تعلق یا مراسم
نہ رہے تھے۔ لیکن اسے اس سے محبت ہوچکی تھی۔ اور کسی نہ کسی طرح وہ اسے اپنے
دامِ محبت میں لانا چاہتا تھا۔ وہ ہر وقت اس سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے کے

لئے کوئی نہ کوئی موقعہ یا بہانہ سوچتا رہتا۔ رفتہ رفتہ الیسقر کی محبت نے اسے اس قدر بیتاب کر دیا۔ کہ وہ اس کے بغیر ماہئی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ راتوں کو الیسقر کے حسن سراپا کا تصور اسے سونے نہ دیتا تھا۔

الیسقر بلا کی حسین تھی۔ اور اس کے حسن میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ہر شخص اس سے مرعوب ہو جاتا تھا۔ ہر کوئی اس کے رعبِ حسن سے متاثر ہو کر اس کے سامنے بات تک نہ کر سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایڈگرایلن پو جیسے کھانے کھیلے انسان کو بھی اس سے بات کرتے ڈر لگتا تھا۔ بہرحال جب اس کے عشق نے جنون کی صورت اختیار کر لی۔ تو اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ ضرور جرأت سے کام لے کر اس سے اظہارِ عشق کر دیگا۔

چنانچہ ایڈگر اکثر اب مسز الیسقر کے سکول کے راستے میں بھٹکتا ہوا نظر آنے لگا۔ ہر روز مسز الیسقر اسے راستے میں ملتی۔ دو چار رسمی باتیں ہوتیں اور بس۔ لیکن ایک دن ایڈگر نے جرأت کر کے اس سے اظہارِ عشق کر ہی دیا۔

بہار کی ایک نہایت ہی خوش گوار شام تھی۔ سورج جنگلوں اور باغوں کی اوٹ سے پرے شفق کی رنگین جھیل میں آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ ہر طرف پھول ہی پھول کھلے تھے۔ درخت اور پودے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے جھوم رہے تھے۔ ایڈگر سڑک پر ایک درخت کے نیچے کھڑا نرگس کے ایک پودے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ یکایک اس کی نظر سامنے کی طرف اٹھی۔ اور اسے دور بہت دور مسز الیسقر اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ اُسے یوں معلوم ہونے لگا۔ جیسے بہار کی دیوی خراماں خراماں آ رہی ہے۔ یا جنت سے کوئی حور نکل کر زمین پر آگئی ہے۔ یا کوئی پری اپنا راستہ بھٹک کر جنگل میں آنکلی ہے۔ فرطِ مسرت سے اس کا دل بلیوں اُچھلنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد مسز الیسقر اس کے قریب آگئی۔ آپس کی دو چار رسمی باتوں کے بعد مسز الیسقر کچھ مسکرا کہنے لگی: "مسٹر ایڈگر! آپ اکثر مجھے راستے میں ملتے ہیں اور کچھ

کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں۔ کیا بات ہے؟ اور ایک دن میں نے آپ کو اپنی ایک کتاب چومتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔
ایڈگر کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ لیکن آج خلاف معمول الیسفر نے اس سے ذرا بے تکلفی سے بات کی تھی۔ اس لئے اسے اظہار مدعا کی جرأت ہو گئی۔ اور کہنے لگا: "مسز الیسفر! آپ میری ایک بات مانیں گی؟"
الیسفر حیران ہو کر کہنے لگی۔ "کہیئے۔ اگر کوئی معقول بات ہوئی۔ تو مجھے ماننے میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔"
ایڈگر کہنے لگا: "مجھے آپ سے نہایت ضروری کام ہے۔"
"کیا کام ہے؟" الیسفر نے پوچھا۔
"یعنی میرا مطلب ہے کہ .... یعنی .... میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ساتھ اس وقت ندی پر چلیں .... گویا .... یعنی .... مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔" ایڈگر نے کچھ سراسیمہ ہو کر کہا۔
"لیکن اب تو شام ہو گئی ہے۔ اور شام کے وقت تو ندی پر تنہا جانا کچھ ...."
ایڈگر الیسفر کی بات کاٹ کر کہنے لگا۔ کہ "نہیں نہیں۔ خدارا انکار نہ کیجئے میرا سخت نقصان ہو گا۔"
الیسفر کچھ پس و پیش کے بعد ہچکچاتی ہوئی اس کے ساتھ ہو لی۔ اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ندی پر پہنچ گئے۔ اور ندی کے کنارے ایک درخت کے نیچے کھڑے ہو گئے۔
یکایک الیسفر نے محسوس کیا کہ ایڈگر کانپ رہا ہے۔ اور اس کے چہرے سے وحشت عیاں ہے۔ ایڈگر کی یہ کیفیت دیکھ کر الیسفر حیران رہ گئی۔ اور گھبرا کر کہنے لگی۔ "ہیں! مسٹر ایڈگر یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کانپ کیوں رہے ہیں۔ اور کھوئی کھوئی

آنکھوں سے آنسو کیوں گھوم رہے ہیں؟"

یکایک ایڈگر الیسقر کے قدموں پر گر گیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ الیسقر بے چاری گھبرا گئی۔ اور اس کے شانے ہلا ہلا کر اس سے پوچھنے لگی۔ کہ "مسٹر ایڈگر! کیا بات ہے؟ مسٹر ایڈگر کیا بات ہے؟ آپ رو تے کیوں ہیں؟"

کچھ دیر بعد ایڈگر اٹھ بیٹھا۔ اور کہنے لگا: "مسز الیسقر مجھے تم سے محبت ہے میں اب تک اس راز کو چھپانے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن آج میں نے محسوس کیا کہ اب یہ راز میرے سینے میں پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔"

الیسقر اس کی بات سن کر حیرت زدہ سی ہو گئی۔ اور کہنے لگی: "مسٹر ایڈگر! مجھے تم سے محبت نہیں۔"

یکایک ایڈگر کی آنکھوں سے دوبارہ آنسو بہنے لگے۔ اور تھوڑی دیر بعد اسے غش آ گیا۔ الیسقر نے جلدی سے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دینے شروع کئے۔ اور اس کا سر اپنے مخملیں زانو پر رکھ کر اپنے نازک نازک ہاتھوں سے اس کا سر سہلانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آ گیا۔ لیکن پاگلوں کی سی گھبرائی ہوئی باتیں کرنے لگا۔ مسز الیسقر نے اسے بہت تسلی دی اور کہا: "اچھے مسٹر ایڈگر! تم ہوش میں آ جاؤ میں تمہاری بہترین دوست ہوں۔"

اس کے بعد الیسقر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر ایڈگر کو زمین پر سے اٹھایا۔ اور اسے گھر لے گئی۔ گھر جاتے ہی ایڈگر بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اور الیسقر کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ ایڈگر کی محبت کس قدر سچی اور پُرجوش ہے۔

ایڈگر تین دن بخار میں مبتلا رہا۔ اور الیسقر ہر روز اس کی خبر لیتی رہی۔ یہ بخار شاید اتفاق ہی سے ایڈگر کو ہو گیا تھا۔ لیکن یہ اس کی ملاقات کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا۔ کیونکہ الیسقر اب روز بروز اس پر مائل ہو رہی تھی۔ اور سمجھتی تھی۔ کہ میرے

عشق نے اسے بیماری میں مبتلا کر دیا ہے۔

صحت یابی کے بعد ایڈگر نے اپنی عاشقی کی مہم جاری رکھی۔ وہ اکثر سکول کے راستے میں کھڑا ہو جاتا۔ اور السیتھر آتی تو وہ منتیں اور التجائیں کرکے اسے ندی پر لے جاتا۔ اور نہایت درد وکرب کے ساتھ اُسے اپنی محبت کا یقین دلاتا۔ عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی مدت میں اُسے ایڈگر کی بے پناہ اور بے لوث محبت کا یقین ہو گیا۔

اب ندی کی ملاقاتیں بوسوں، ہم آغوشیوں اور اظہار محبت کی باتوں میں کٹنے لگیں۔ لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد عاشق اور محبوبہ کے تعلقات میں کچھ زیادہ بے تکلفی آتی گئی۔ اور السیتھر چھپ چھپ کر راتوں کو ایڈگر کے گھر آنے لگی۔

ان دونوں کے تعلقات کو ایک ہی سال کا عرصہ گزرا تھا۔ کہ حسین السیتھر نے محسوس کیا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہے۔ کچھ مدت تو یہ بات چھپی رہی۔ لیکن بالآخر سکول میں السیتھر کے متعلق چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ایک دن سکول کی ہیڈ مسٹرس نے السیتھر کو بلا کر پوچھا کہ "السیتھر میں کچھ مدت سے تمہارے جسم میں ایک خاص تبدیلی دیکھ رہی ہوں۔ اور مجھے شک ہے۔ کہ کہیں تم کسی بچے کی ماں تو نہیں بن رہیں"

دوسرے دن لوگوں نے السیتھر کی لاش ندی میں تیرتی ہوئی پائی ———

ایڈگر ایلن پو کا یہ پہلا خوفناک گناہ تھا۔ گو اسے السیتھر کی موت کا بہت غم ہوا لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

——— (۳) ———

ایڈگر کے افسانے اب ملک میں زبان زد خاص و عام ہو چکے تھے۔ شہرت اور عظمت اس کے قدم چوم رہی تھی۔ اس کے مداحوں میں بے شمار عورتیں بھی تھیں۔ ایک حسین و

جمیل عورت کی اس سے عاشقانہ خط و کتابت تھی۔ یہ عورت ایک انگریز کاونٹ کی بیوی تھی۔ ایڈگر ہر روز کسی نہ کسی عورت کو اپنی ہوس کا مرکز بناتا تھا۔ کئی دوشیزاؤں کا جوبن وہ چٹکیوں میں مسل چکا تھا۔ اور کتنی بیاہتا عورتوں کی عصمت کے بیش بہا خزانوں پر ڈاکے ڈال چکا تھا۔ پھر بھی اُسے چین نہ آتا تھا۔ وہ عورتوں کا دیوانہ تھا۔ جہاں کہیں اسے کوئی عورت نظر آتی۔ اس کا دل بے تابو ہو جاتا۔

یہ ایک قدرتی بات ہے کہ ایک عورت دوسری عورت کے سامنے ایک مرد سے کھلم کھلا محبت یا اظہارِ محبت کرنے سے سخت گھبراتی ہے۔ عورت چاہے کس قدر آزاد منش اور بے باک ہو۔ وہ دوسری عورت کے سامنے ایک اجنبی مرد کے قرب سے بہت شرماتی ہے۔ لیکن ایڈگر کی عیش پسند طبیعت کا معیار کچھ اس قدر رنگین تھا کہ وہ جان بوجھ کر محبت کے وقت دوسری عورت کو بھی اپنے پاس رکھتا تھا۔ تاکہ جس عورت سے وہ عملی عشق کر رہا ہو وہ شرمائے۔ اور ایڈگر اس کی شرم و حیا کا منظر دیکھکر لطف اٹھا سکے۔

اس کے شبستان میں دو محبوباؤں کا موجود ہونا تو ایک معمولی بات تھی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ اکثر دھوکے سے چار چار یا پانچ پانچ عورتوں کو اپنے کمرے میں بند کر لیتا۔ اور ان پریوں کو لباس کی قید سے آزاد کر کے خود اپنے کمرے کے بڑے قالین پر لیٹ جاتا۔ اور ان مرمریں اور مخملیں جسموں کے فرش پر اس طرح لوٹتا۔ جیسے بچے گھاس کے فرش پر خوشی سے لوٹتے ہیں۔

ہاں تو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ کہ ایک کاؤنٹ کی بیوی سے ایڈگر ایلن پو کی عشقیہ خط و کتابت تھی۔ وہ ایڈگر کو چاہتی تھی۔ اور ایڈگر کو بھی اس سے غائبانہ عشق ہو چکا تھا۔ ایک دن ایڈگر اس سے ملنے کے لئے اس کے شہر جا پہنچا۔ عورت کا شوہر ان دنوں گھر پر موجود نہیں تھا۔ یہ عورت بھی ایڈگر کے دام ہوس کاری سے نہ بچ سکی۔ اسے ایڈگر کے

ساتھ نمایاں عشق تو کرتا ہی۔ وہ اس سے بڑے تپاک کے ساتھ ملی۔ اور اس کے جذبۂ محبت میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ اس عورت کا نام مسز ہیریٹ تھا۔ یہ خود بھی ایک قابل اور عالم و فاضل عورت تھی۔ محبت کے متعلق اس کے نظریات ایڈگر سے بہت مختلف اور عجیب و غریب تھے۔ اس کا خیال تھا۔ کہ محبت میں ہوس کو کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے۔ اصل محبت وہی ہے جو پاک ہو۔ چنانچہ اپنے خطوں میں بھی وہ بار بار اپنے خیالات کا اظہار کر چکی تھی۔ لیکن ایڈگر اس کے خطوط پڑھکر ہنس دیا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا۔ اچھا! جب میں اس سے ملونگا۔ تو دیکھا جائیگا۔ کہ محبت میں ہوس کا دخل بھی کس قدر ضروری ہے؟

چنانچہ جب وہ اس کے شہر میں اس کے گھر مہمان کے طور پر گیا۔ تو وہاں اس نے تین روز قیام کیا۔ دو روز تو اظہارِ محبت کی معمولی باتیں ہوتی رہیں۔ جن سے ایڈگر کو معلوم ہوا کہ مسز ہیریٹ بھی بڑی طرح اس پر فریفتہ ہے۔ لیکن اس عرصے میں مسز ہیریٹ نے ایک مرتبہ بھی اپنے جسم کو ایڈگر کے گناہ آلود جسم سے مس نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ ایڈگر نے اس عورت کے بوسے لینے کی لاکھ کوشش کی۔ مگر وہ رضامند نہ ہوئی۔ ہر وقت کسی نہ کسی حیلے سے اپنے آپ کو بچاتی رہی۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ میرا جسم میرے شوہر کا ہے۔ اور میرے دل اور روح کا مالک ایڈگر ہے۔ ایڈگر کا خیال اس کے بالکل برعکس تھا۔ اسے اپنی محبوبہ کے دل اور روح کا مالک بننے کی آرزو نہ تھی۔ وہ اس کے مخملیں جسم، پھول کے سے رخساروں اور شہد جیسے میٹھے اور سرخ ہونٹوں سے محبت کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ اسے ہدیۂ دل و جان پیش کرنا چاہتی تھی۔ سو ایڈگر بمشکل صرف ایک مرتبہ اس کا ہاتھ چومنے میں کامیاب ہو سکا۔ اور وہ بھی کافی کشمکش کے بعد۔

مسز ہیریٹ ایڈگر کو مقدس بزرگوں کا سا درجہ دیتی تھی۔ اور اس کے دل میں اس کی بڑی عزت تھی۔ وہ کسی طرح ایڈگر کو ناخوش نہ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے ہر حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔ جس دن ایڈگر کو واپس جانا تھا۔ اس سے پہلی

رات کو وہ اس کے سنبستان میں بیٹھا تھا۔ اور رات کافی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ایڈ گر مسٹر ہیریٹ کو ایک دو مرتبہ ہم آغوش کرنے کی کوشش کر چکا تھا۔ لیکن وہ اس میں اب تک ناکام رہا تھا۔

آخر اس نے زبردستی اپنی محبوبہ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ بیچاری مسز ہیریٹ خندول اس سے منتیں کرتی رہی۔ کہ وہ یہ حرکت نہ کرے۔ لیکن اس کی تمام آہ وزاری بیکار گئی۔ اگر وہ چاہتی۔ تو اس وقت ایڈگر کو دھکے دلوا کر باہر نکلوا سکتی تھی۔ لیکن اس کے دل میں ایڈگر کے لئے اتنی عزت تھی۔ کہ وہ بےبس ہو کر رہ گئی۔

مسز ہیریٹ کی زندگی میں یہ پہلا لرزہ خیز اور خوفناک حادثہ تھا۔ وہ ایک پارسا عورت تھی۔ محبت اس کے نزدیک جائز تھی۔ لیکن ہوس کاری سے اسے سخت نفرت تھی۔ چنانچہ جب ایڈگر نے پہلی مرتبہ اسے ہوس آلود کیا۔ تو وہ زار وقطار رونے لگی۔ صبح ایڈگر کو رخصت کرنے سے پہلے بھی وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ اور اسے رخصت کرتے وقت کہنے لگی۔ "ایڈگر تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ تم میرے دوست ہو۔ لیکن آہ تم نے مجھ سے دشمنی کی!"

ایڈگر تو اسے الوداع کہہ کر چلا گیا۔ لیکن اس کا شوہر ڈیڑھ ماہ تک واپس نہ آیا۔ کسی ضروری کام کی وجہ سے اُسے مجبوراً ڈیڑھ ماہ گھر سے باہر رہنا پڑا۔ مسز ہیریٹ کو اپنی پاکیزگی لٹ جانے کا بیحد صدمہ تھا۔ وہ ہر وقت اداس اداس رہتی تھی۔ کچھ مدت کے بعد اس کا شوہر بھی واپس آ گیا۔ مندرجہ بالا حادثے کے بعد مسز ہیریٹ کے ایک بچہ پیدا ہوا۔

اگرچہ بات کسی کو معلوم نہ تھی۔ یہاں تک کہ اس کا شوہر بھی اس بات سے ناواقف تھا۔ کہ مسز ہیریٹ کا یہ بچہ گناہ کی ایک رات کی یادگار ہے۔ لیکن مسز ہیریٹ یہ اچھی طرح جانتی تھی۔ کہ یہ ایڈگر کا بچہ ہے۔ اپنی پاکیزگی لٹ جانے کا غم ہی اسے کچھ کم نہ تھا۔ جب اسے اپنے گناہ کی ایک مستقل نشانی بھی مل گئی۔ تو اسے اس بات کا اور بھی زیادہ صدمہ

ہوا۔ وہ اکثر اس بچے کو دیکھ کر رو دیتی۔ بلکہ گھنٹوں روتی رہتی۔ اس حادثے کے غم نے اسے اس قدر دہشت زدہ کر دیا۔ کہ اب اس نے ایڈگر کو خط لکھنے بھی بند کر دیئے۔

کچھ مدت بعد اسی غم نے اس کی صحت خراب کر دی۔ اور وہ بیمار رہنے لگی۔ اور اسی بیماری میں اس کا انتقال ہو گیا۔ انتقال سے کچھ مدت پہلے اس نے ایڈگر کو بلایا۔ تاکہ آخری مرتبہ اپنے ہوس کار محبوب کو دیکھ لے۔ یا اس بچے کی حقیقت کے متعلق اسے خبر کرے۔ لیکن ایڈگر اب دوسری عورتوں سے دادِ عیش و عشرت لینے میں مصروف تھا۔ اس نے اپنی پاکباز محبوبہ کا آخری مرتبہ دیدار کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ مسز ہیریٹ کا انتقال ہو گیا۔

(۴)

ایڈگر کی تمام زندگی ہوس کاری اور گناہوں میں گزری۔ اگرچہ اس کا شمار ملک کے بہترین افسانہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ لیکن اسے اپنی عزت اور شہرت کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ وہ بے حد شراب پیا کرتا۔ اور بعض اوقات اس قدر پی لیتا کہ بیہوش ہو جاتا۔ اکثر وہ کسی نہ کسی بہانے سے دو شیزاؤں اور دوسری واقف عورتوں کو اپنے گھر لے آتا۔ وہاں یا تو زبردستی یا کسی اور بہانے سے انہیں تیز شراب پلا کر مدہوش کر دیتا۔ جب وہ نشۂ شراب میں مخمور ہو جاتیں۔ تو ان کے عشقیہ جذبات بھڑکانے میں اسے کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ اور وہ فوراً ان کے گلشنِ حسن سے گلچینی کرنے لگتا۔

ایڈگر ایلن پو کو ایک دھوبی کی بیوی سے بھی محبت تھی۔ عموماً وہ ہر عورت کے ساتھ وصل کی چند راتیں بسر کرنے کے بعد اسے کھلونے کی طرح پھینک دیتا اور اسے فراموش کر دیتا۔ لیکن اس عورت سے مستقل چھ سال تک اسکے تعلقات قائم رہے۔

یہ عورت بیحد فاحشہ تھی۔ لیکن اس کا شوہر ایک شریف آدمی تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ایڈگر ایلن پو کو اپنی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالے ہوئے اور اس کا منہ چومتے ہوئے

دیکھ لیا۔ اسے سخت غصہ آیا۔ اس نے نہ صرف اپنی بیوی کی مرمت کی۔ بلکہ ایڈگر سے بھی دست و گریباں ہو گیا۔ اس لڑائی میں ان دونوں کو کافی چوٹیں آئیں۔ لیکن نہ تو ایڈگر نے اس عورت کا پیچھا چھوڑا۔ نہ یہ عورت ہی ایڈگر سے تعلقات قائم رکھنے سے باز آئی۔

ایڈگر کی پوشیدہ زندگی بہت بھیانک اور تاریک رہی۔ اور اس کی موت کا واقعہ بھی بہت عبرتناک ہے۔ بات یہ تھی کہ ایڈگر ایک مرتبہ ایک سکول کی نوخیز طالبہ کو جو بمشکل سن شباب کو پہنچی تھی۔ کسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے آیا۔ اس وقت وہ کافی شراب پیئے ہوتے تھا۔ اس نے اپنے مکان کے دروازے بند کر دیئے اور اس لڑکی کو کافی سے زیادہ شراب پلا دی۔ اس کے بعد اس نے اسے بے خود کر کے ایک کلی کی طرح اپنی گود میں اٹھا کر اپنے بستر پر لا ڈالا۔ اور آہنی دیو نے ایک چھوٹی سی خوبصورت پری کو ہمیشہ کے لئے تباہ کر دیا۔

کہا جاتا ہے۔ کہ تمام رات ایڈگر خود بھی شراب پیتا رہا۔ اور اسے بھی زبردستی پلاتا رہا۔ آج اس نے اس قدر شراب پی لی تھی۔ کہ اسے اپنے بھیانک گناہ کا احساس تک نہ ہوا۔

اس نے صبح تک شغل مے نوشی جاری رکھا۔ پو پھٹنے کے وقت وہ اور شراب لانے کے لئے بستر سے اٹھا۔ یکایک اس کا پاؤں ڈگمگایا۔ اور وہ ٹھوکر کھا کر ایک نالی میں گر گیا۔ صبح لوگوں نے دیکھا۔ کہ امریکہ کا زبردست اور عالی مرتبت انشاء نگار ایک نالی میں مردہ پڑا ہے۔ اور اس کا تمام جسم اور کپڑے گندے کیچڑ میں لت پت ہیں۔

پولینڈ کی حُور

پولینڈ کے شہزادے مائیکل ریڈزویل اور مس ایٹکنسن کی داستان عشق پولینڈ کی تاریخ کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ عشق و محبت کا یہ ڈرامہ محبوبہ کے مندرجہ ذیل خط پر ختم ہو گیا۔

"سہ پہر ہیں، نہ جانے کتنی مرتبہ مجھ ناچیز کی کوششوں سے "اس" کی جان بچی۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔ میرے پاس روپیہ آتا۔ تو میں اسے دونوں ہاتھوں سے اس کی خاطر لٹا دیتی۔۔۔ ۔۔۔۔۔ خود دوائیں خریدتی تھی۔ میں نے اپنے "مریض" کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کی۔۔۔۔۔۔ جب اس کی کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی تو میرے سینے میں ایک ہوک سی اٹھتی۔ مجھے یوں معلوم ہوتا۔ جیسے میرے سینے میں کسی نے دو دھارا خنجر گھونپ دیا ہے۔

خداوند انصاف و قانون آخر کچھ بتائیں بھی تو کہ مجھے کس جرم کی پاداش میں ملک بدر کیا جا رہا ہے۔۔۔۔۔ پولینڈ کے ساتھ یہ آخری "جنگ" میرے لئے ناقابلِ برداشت ہے۔ دفتر امور خارجہ معلوم نہیں۔ کیوں میری گذارشات پر توجہ نہیں دیتا۔"

مندرجہ بالا سطور مس میری جین جوزیفائن ایٹکنسن کے اس الم انگیز مکتوب کا ملخص ہیں۔ جو اس نے انتہائی بے قراری میں اپنے ایک دوست کو بھیجا۔

مس ایٹکنسن نو سال تک پولینڈ کے ایک شہزادے پرنس مائیکل ریڈزویل کی نرس کمپینین رہی۔ اور دل و جان کے ساتھ اس کی محبت کا دم بھرتی رہی۔

یہ خط خودکشی سے چند دن پہلے اس نے لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر اپنے

وکیل اور عزیز ترین دوست مسٹر برنارڈ آرتھر ائیٹک وکیل کو لکھا۔ تمام کا تمام خط نہایت
دردناک ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مس اٹیکنسن نے پولینڈ کے اس
شہزادے سے کس طرح دیوانہ وار محبت کی۔ جب پولینڈ سے اسے نکال دیا
گیا۔ تو وہ اپنے محبوب کی فرقت کی تاب نہ لا سکی۔ اور اس نازک کلی کی طرح ہمیشہ
ہمیشہ کے لئے مرجھا کر رہ گئی۔ جسے گرما کی تند ہوا شاخ سے جدا کر کے تپتی ہوئی
زمین پر گرا دے۔

اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ مرتے وقت اس حسینہ کے مفلس اور قلاش
ہونے کی وجہ کیا تھی۔ وہ عورت جو انتہائی ناز و نعم میں پلی تھی۔ جس نے بڑے بڑے
شاندار محلات میں زندگی بسر کی تھی۔ دولت جس کے گھر کی لونڈی تھی۔ جب اپنی جان
جان آفریں کے سپرد کر چکی۔ اور اس کے متعلقین نے اس کی جیب کی تلاشی لی۔ تو بٹوے
سے صرف ایک ٹاٹ پنی کیوں برآمد ہوئی۔۔۔ جب وہ ہمیشہ کی نیند سو گئی۔ تو
اس کے ذمے ہوٹل والوں کی کچھ رقم باقی تھی۔

میری اٹیکنسن کی حسرت ناک موت ایک ایسا غمناک سانحہ ہے جس کی نظیر
نہیں مل سکتی۔ اس کی زندگی کا افسانہ عظیم الشان قربانی فرض شناسی اور ایثار کا ایک
سبق آموز نمونہ ہے۔

ان مریضوں کے بغیر جس کی سالہا سال اس نے خدمت کی تھی۔ جس کی کئی بار اس نے
جان بچائی تھی۔ جسے آرام پہنچانے کی خاطر اس نے کئی راتیں سوئے بغیر گذاری تھیں۔
جس کے لئے وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتی تھی۔ جس کی سلامتی کے لئے وہ ہر وقت
خدا سے دعائیں مانگتی تھی۔ اس کی زندگی بیکار تھی۔ وہ ایک ایسا پھول تھی جو محبت
کی خوشبو سے شاداب ہو۔ ایک ایسا ستارہ تھی۔ جو محبت کے نور سے جگمگا رہا ہو۔
جب اسے محبت سے محروم کر دیا گیا۔ جب اس سے خوشبو چھین لی گئی۔ جب اس کا

نور سلب کر لیا گیا۔ تو وہ ایک مرجھایا ہوا پھول اور بے نور ستارہ بن کر رہ گئی۔

برطانیہ میں بہت کم عورتوں نے ایسے دردانگیز حالات میں پستول کی گولیوں سے رشتۂ جسم و جان منقطع کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ "جدائی کے حادثے" نے اس پر جنون کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس کی نازک روح کو ایک ناقابلِ برداشت صدمہ پہنچا تھا۔ حالات سے مجبور ہو کر اس نے اپنا پستول جس کے دستے میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اٹھایا۔ اور زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

اس کے ایک خط کی عبارت میں ذیل کا حصہ خاص طور پر قابلِ غور ہے۔

"مائی ڈیئر مسٹر لزاردس!

انگلستان اور پولینڈ میں میری جتنی جائداد اور دولت ہے۔ وہ میں تمہیں سونپتی ہوں۔ بلا شرکتِ غیرے تم اس کے مالک ہو۔ کیونکہ تم جانتے ہی ہو۔ کہ میرا کوئی رشتہ دار نہیں۔

تم نے دوران گفتگو میں کئی بار مجھ سے پوچھا ہے۔ کہ میں نے شہزادہ ریڈزویل کو کیوں اپنا تمام روپیہ دے دیا۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ میں اس کی نرس تھی۔ وہ میرا مریض تھا۔ اور بہت نحیف و ناتواں مریض۔ ہر سرما میں میں اس کی جان بچاتی رہی۔

گزشتہ چار سال سے اس کی جائیداد کے محکمہ بندوبست نے اس کی علالت کے دوران میں بھی ایک پائی تک نہ بھیجی۔ مجھے اس کی جان بچانے کے لئے بہت سا روپیہ صرف کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ اکثر اس کے پھیپھڑوں پر سردی کا بہت بُرا اثر ہو جاتا تھا۔

میرے پاس روپیہ تھا۔ میں کس طرح گوارا کر سکتی تھی۔ کہ میرا مریض تکلیف میں ہو اور میں بخیل بن کر اپنا روپیہ اپنے پاس جمع رکھوں۔ یہ میرا فرض تھا۔ جو میں نے ادا کیا۔ شہزادے کا اس وقت دنیا میں اگر کوئی تھا۔ تو وہ صرف میں تھی۔

چار سال پہلے میں بہت سی مشکلات میں مبتلا تھی۔ شہزادے کی حالت بھی بہت

زیادہ خراب تھی۔ میں اس کے ایک رشتہ دار پرنس ـــــــ کو ٹیلیفون کیا۔ کہ وہ یہاں آکر اس سلسلے میں میری کچھ مدد کرے۔ وہ آگیا۔ میں نے اسے اپنی تمام مشکلات سے آگاہ کیا۔ اور بتایا کہ میں شہزادے کی خوراک اور اس کے علاج پر اپنا روپیہ صرف کرتی رہی ہوں۔ نوکروں کو بھی میں ہی تنخواہ دیتی ہوں۔ اور تمام ادویات بھی اپنے پاس سے منگاتی ہوں۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس نے مجھ سے بہت سنہری وعدے کئے۔ اس نے کہا۔ کہ میں وہ تمام رقم جو تم شہزادے کے علاج پر خرچ کر چکی ہو۔ تمہیں فوراً واپس کرانے کا انتظام کروں گا۔ لیکن اس کے بعد میں نے نہ کبھی اسے دیکھا نہ سنا۔ اس نے اپنا کوئی وعدہ پورا نہ کیا۔

خدا کے لئے ذرا میرا نقطہ نظر سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہ کس طرح ممکن تھا۔ کہ ایک مریض کی ضروریات روپے کی وجہ سے رکی رہیں۔ وہ محض روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے تباہ حال اور زار و نزار ہو جائے۔ اس کی ضروریات پورا نہ کرنا میرے لئے ایسا ہی تھا۔ جیسے کوئی میرے سینے میں انگارے رکھدے۔ جس طرح کوئی میرے دل و دماغ کو آگ لگا دے۔

میں تمہاری امداد، قابلِ قدر مشوروں اور دوسری عنایات کی بیحد ممنون ہوں "

تمہاری عزیز دوست
میری اٹیکنس

اس خط کے ایک گوشے پر ذیل کی عبارت بھی لکھی تھی۔
"میرے کپڑوں کے صندوق میں زیورات رکھنے کی ایک ڈبیا ہے۔ اس میں دو ٹائی پن رکھے ہیں۔ یہ ہز ہائی نس کے ہیں۔ میرے دوسرے صندوق میں ایک

چھوٹے سے پیکٹ میں بھی دو ٹائی پن، کف لنکس اور کچھ بٹن رکھے ہیں۔ یہ پرنس صاحب نے مجھے سنبھال کر رکھنے کے لئے دیئے تھے۔ ۱۹۲۹ء سے یہ میرے پاس پڑے ہیں۔ میں نے ایک عزیز ترین متاع سمجھ کر انہیں بڑی حفاظت سے اپنے پاس رکھا ہے۔"

نو سال تک مس اٹیکنسن جیسا کہ اس کے خط سے پتہ چلتا ہے۔ شہزادے کی تیمارداری کرتی رہی۔ بطور سیکرٹری اس کی جائیداد اور قلعہ وغیرہ کا انتظام بھی کرتی رہی۔ اس کی خودکشی کا راز اس کے عزیز ترین دوست مسٹر لیزاردس نے افشا کیا۔ جسے خود اس حسینہ سے بے حد محبت تھی۔

مسٹر لیزاردس نے اس کی خودکشی کا راز افشا کرتے ہوئے اپنے ایک گہرے دوست مسٹر ڈی کو بتایا۔ کہ آج سے دو ماہ پہلے نامعلوم وجوہ کی بنا پر اسے پولینڈ سے فوراً ہمیشہ کے لئے چلے جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

جب وہ روانہ ہونے لگی۔ تو اس کے محبوب پرنس رینڈزویل نے اس سے وعدہ کیا۔ کہ میں جلد ہی ڈنبزگ میں تمہارے پاس چلا آؤں گا۔ لیکن وہ کبھی اس کے پاس نہ آیا۔ ہمیشہ طرح طرح کے بہانے بنا کر اسے ٹالتا رہا۔

آخر مس اٹیکنسن کے سینے میں عشق کی آگ اس طرح بھڑک اٹھی۔ کہ وہ دیوانی سی ہو گئی۔ اس کے پاس مکہ بسر ہونے کے لئے اس قدر کم وقت تھا۔ کہ وہ پولینڈ کی جائیداد تک فروخت نہ کر سکی۔ نہ اپنا روپیہ وصول کر سکی۔ اس بیماری کو علاج پہنچنے کے لئے اپنے قیمتی زیورات گروی رکھنے پڑے۔

اس کے بعد وہ خط امیر کے پاس پہنچی۔ اور مجھ سے کہا۔ کہ "تم پولینڈ جاؤ۔ شہزادے سے مجھے کچھ روپیہ لا دو۔ میرے متعلق کوئی تشویش نہ کرو۔ میں ایک ٹرینڈ نرس ہوں اپنے گذارے کے لئے کافی روپیہ کما سکتی ہوں۔"

شہزادے نے اس کا بہت سارا روپیہ بطور قرض لے لیا تھا۔ اور بہت سا اس کی

تیمار داری اور علاج پر صرف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اس نے شہزادے کو کئی خط لکھے۔ کہ "تمہارے بغیر میری زندگی بیکار ہے۔ میں دیوانی ہو رہی ہوں۔ تمہیں کئی خط لکھ چکی ہوں۔ لیکن کوئی جواب نہیں آتا۔ آخر مجھ سے کونسی خطا سرزد ہو گئی ہے۔ خدا کے لئے مجھے ایک خط تو لکھ دو۔ تمہارے وعدے کیا ہوئے۔ آخر تم نے کیوں مجھ سے پیمانِ وفا باندھا تھا۔ میرے دل میں دردِ محبت کی جو ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔ وہ میرے جسمِ ناتواں کے لئے ناقابلِ برداشت ہیں۔ مجھ کو دونوں جہانوں سے بیگانہ کر کے تم نے کیوں چپ سادھ لی۔ مجھے گھائل کر کے تم بے پرواہ کیوں ہو گئے۔ کیا تمہیں اپنی علالت کا زمانہ یاد ہے۔ تمہارے درد سے میں کس طرح بیقرار ہو جاتی تھی۔ کیا میں تمہارے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر نہیں رویا کرتی تھی؟ کیا میں یہ دعا نہیں مانگا کرتی تھی۔ کہ تم اچھے ہو جاؤ۔ اور تمہارا مرض مجھے لگ جائے"۔

اس قسم کے کئی خطوط میری اٹیکنسن نے اپنے سنگدل، بیوفا اور احسان ناشناس محبوب کو لکھے۔ لیکن ان کا کوئی جواب نہ آیا۔

اس واقعہ کے بعد دیکھا گیا۔ کہ لنڈن کے ایک شاندار ہوٹل میں عطر میں بسے ہوئے ایک بستر پر مس میری اٹیکنسن بے حس و حرکت پڑی ہے۔ اس کا بستر اور خوشنما لباس خون سے لت پت ہے۔ اور پستول کی گولی اس کے سینے کو چیرتی ہوئی پار نکل گئی ہے۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش لیکن درد انگیز مسکراہٹ تھی۔

ریجن فلوری

ریجن فلوری فرانس کی مشہور و معروف رقاصہ اور ایکٹرس تھی۔ پہلے پہل سٹیج پر نیم برہنہ آنے کی رسم اسی نے جاری کی۔ اس رسم پر اخلاقی نقطہ نظر سے شاید نکتہ چینی کی جائے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ریجن کی شہرت کو اسی نے چار چاند لگائے۔

ریجن فلوری ایک ایسی شمع حسین تھی۔ جس کی ضیا نے سرزمین فرانس کے بے شمار عالی مرتبت نوجوانوں کے دلوں کو منور کر رکھا تھا۔ وہ حسن کی دیوی تھی۔ اور ہر نوجوان اس کی چوکھٹ پر سجدہ نیاز کرنا اپنی خوش بختی تصور کرتا تھا۔ لیکن پیرس میں بہت کم لوگ ایسے ہونگے۔ جن کے ساتھ فلوری کے گہرے مراسم ہوں۔ وہ ایک مغرور حسینہ تھی۔ اور کوئی نوجوان اس کی عظمت حسن کا مقابلہ کرتے ہوئے اس سے اظہار محبت کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ دولت اس کے گھر میں کھیلتی پھرتی تھی۔ اور حسن اس کی دربانی کرتا تھا۔ اسے کسی چیز کی پرواہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس کی خوش بختی کا ستارہ آسمان مسرت پر پوری تابانی سے چمک رہا ہے۔ لیکن اس راز سے صرف فلوری ہی واقف تھی۔ کہ قسمت کی بپھری ہوئی دیوی ہاتھوں میں ایک خنجر آبدار لئے اس کے مقابلے کو کھڑی ہے۔ اور کسے علم تھا۔ کہ فرانس کے گلستانوں کی یہ پری کبھی انتہائے یاس سے اپنی خوبصورت گردن تقدیر کی دیوی کے سامنے آہستہ سے جھکا دیگی۔ اور اس کی تلوار کا ایک ہی وار اسے موت کی آغوش میں سلا دیگا۔

جس وقت حسن کی اس دیوی نے خودکشی کی ——— جس وقت سرزمین فرانس کا یہ خوبصورت چاند غروب ہوا ——— جس وقت یہ خوبصورت ترین پری ہمیشہ کی نیند

سوتی۔ فرانس کے بیشمار متمول ترین آدمی اسے اپنی رفیقۂ حیات بنانے کے لئے تیار تھے۔ یورپ کے تمام تھیئٹر اور رقص گاہیں اسے بلانے کے لئے نہ صرف ہر وقت اس کی منتیں اور خوشامدیں کرتی رہتی تھیں۔ بلکہ اس مقصد کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرنے کو بھی تیار تھے۔ چنانچہ مرتے وقت فلوری نے مال و دولت کے علاوہ پندرہ لاکھ روپے کے صرف زیورات ہی چھوڑے۔

آخر وہ کونسی تمنا تھی۔ جس نے فلوری کو عنفوانِ شباب ہی میں اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ چیز" تمنائے محبت" کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے حسن کی دیوی نے محبت کی دیوی سے محبت کی بھیک مانگی۔ لیکن اس بے رحم نے اس کی التجا کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا۔ اور آخر وہ عورت جس کے چرچے یورپ کے بچے بچے کی زبان پر تھے۔ جسے رقص کرنے اور گانے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ ایک سنگدل مرد کے دامِ محبت میں اسیر ہونے کے بعد موت سے جا ہمکنار ہوئی۔

اس کا محبوب کون تھا؟ پیرس تھیئٹر" کا ایک معمولی آرٹسٹ! کیا فلوری کو یقین تھا۔ کہ اسے اپنی پہلی ہی محبت میں ناکامی ہوگی؟ کیا اسے معلوم تھا۔ کہ محبت اس کے غرورِ حسن کو آنِ واحد میں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیگی؟ نہیں اُسے یقین تھا۔ کہ دنیا کے کسی بھی بڑے نامور دولتمند اور خوبصورت آدمی پر وہ ایک نگاہِ ناز ڈال دے۔ تو وہ ہمیشہ کے لئے اس کا غلام بننے کو تیار ہو جائے گا۔ لیکن جب فلوری کو معلوم ہوا کہ دنیا میں ایک شخص ایسا بھی ہے جس پر اس کے حسن کا جادو نہیں چل سکتا۔ تو وہ دل شکستہ ہو گئی۔

یہ واقعہ یوں پیش آیا۔ کہ فلوری نے ایک دن اس آرٹسٹ کو اپنے باغ میں بلایا چودھویں کے چاند سے نور کی کرنوں کے فوارے پھوٹ رہے تھے۔ اور شوخ اداؤں ہوائیں انتہائی بے تابی سے پھولوں اور کلیوں کے خوبصورت منہ چوم رہی تھیں فلوری

اپنے آرٹسٹ کے انتظار میں ایک گھنٹے سے کنج میں بیٹھی تھی۔ اس وقت اس نے بہترین لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ اور رنگا رنگ لباس میں وہ ایک طائرِ بہار معلوم ہو رہی تھی۔ جب دور سے اُسے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے محبوب کے تصور سے اس کے جسم کی رگ رگ میں ایک مسرت انگیز سنسنی کی خوشگوار لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اور رگوں میں گردش کرتا ہوا خون اسے تندو تیز شراب کی طرح اس کے جسم کے اندر خوبصورت موجیں مارتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

ابھی اس کا محبوب اس سے چند قدموں کے فاصلے ہی پر تھا۔ کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور دوڑ کر اس سے جا لپٹی۔ اور بیتابی سے اس کی گردن میں اپنے بازو ڈال دیئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندیاں اور اس کے گلے سے ہچکیوں کا ایک طوفان بہ نکلا۔ اس نے اظہار محبت کا ایک لفظ تک لب پہ لانے کی ضرورت نہ سمجھی اور حقیقت ہے۔ کہ اظہار محبت کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے؟

سنگدل آرٹسٹ نے اس کے ہاتھوں اور گدراتے ہوئے عریاں بازوؤں کو بے پروائی سے پرے جھٹک دیا۔ اور کہنے لگا۔ "کہو کیا کہتی ہو؟"

فلوری نے جواب دیا۔ "محبت کی بھیک! ——— مجھے اپنی رفیقہ حیات ——— اپنی خادمہ بنا لو!"

آرٹسٹ نے رکھائی سے جواب دیا۔ "افسوس یہ نہیں ہو سکتا!" ——— اور باغ سے چلا گیا۔

فلوری کے لئے یہ صدمہ کوئی معمولی نہ تھا۔ اس کی عمر میں یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ کسی نے اس کی محبت کو پائے استحقار سے ٹھکرایا ہو۔ لیکن کو اس سے کوئی معمولی محبت نہ تھی۔ اس کی محبت کا نقش اس کے دل پر نقش فی الحجر کی طرح دوامی صورت اختیار کر گیا تھا۔ وہ اس آرٹسٹ پر دل وجان سے فریفتہ تھی۔ اور اسے دنیا بھر میں محبت

کرنے کے لئے بہترین شخص خیال کرتی تھی۔ لیکن قضا و قدر کی دیوی فیصلہ کر چکی تھی۔ کہ اس معمولی آرٹسٹ کے ہاتھوں فرانس کی اس ملکۂ حسن کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو۔

اب فلوری کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ اس نے پیرس میں پہلی مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام رہی۔ آخر دو سال بعد اس نے پھر انتہائی بیتابی سے موت کی دیوی کے سامنے اپنے خوبصورت بازو پھیلائے۔ اور موت کی دیوی نے اس پر رحم کھا کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

فلوری آج سے اڑتالیس سال پہلے فرانس کے مشہور و معروف اور خوبصورت شہر مارسلیز میں پیدا ہوئی۔ اس کے ماں باپ کی مالی حالت اگرچہ بُری نہیں تھی۔ تاہم وہ اتنے امیر بھی نہیں تھے۔ جب فلوری پیدا ہوئی۔ تو وہ اس کا پھول سا حسین چہرہ دیکھکر حیران رہ گئے۔ وہ دل ہی دل میں سوچتے۔ کہ شاید خدا نے پرستان کا کوئی بچہ ہمارے گھر بھیج دیا ہے۔

دس سال کی عمر میں ہی فلوری کا چلبلاپن ظاہر ہونے لگا۔ جب اس کے باپ کی تمباکو کی دکان پر کوئی خریدار آتا۔ تو اس کے چلے جانے کے بعد وہ دیر تک اس کی وضع قطع اور طرز گفتگو کی نقلیں اتارا کرتی۔ پڑھنے اور گھر کا کام کاج کرنے میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ آخر کار اس کی ماں اس کی ان عجیب و غریب حرکتوں سے تنگ آ گئی۔ وہ اکثر اپنے پڑوسیوں سے شکایت کیا کرتی۔ کہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ ریحون کا دل کس کام میں لگے گا۔ نہ اسے پڑھنے کا شوق ہے نہ گھر کے کام کاج سے اسے رغبت ہے۔ بس وہ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر گھنٹوں دیوانوں کی طرح اپنا منہ چڑاتی رہتی ہے۔

آخر ریحین کے والدین کو جس بات کا خطرہ تھا۔ وہی ہوئی۔ پندرہ سال ہی کی عمر میں اس نے گھر کو خیرباد کہہ دیا۔ اس حادثے کا والدین کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اور جب

انہوں نے یہ خبر سنی۔ کہ وہ پیرس کے سکالا تھیٹر میں ملازم ہو گئی ہے۔ تو زمین ان کے پاؤں تلے سے نکل گئی۔ لیکن ریچل کو ان باتوں کی کیا پرواہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی شہرت کا ستارہ فی الحال دھندلے دھندلے بادلوں میں گھرا ہوا ہے۔ اور وہ وقت جلد آنے والا ہے۔ جب وہ آسمانِ شہرت پر پوری تابانی سے زہرہ اور مشتری کی طرح جگمگائے گی۔

سکالا تھیٹر میں اپنا پارٹ ادا کرنے کے بعد وہ وہاں کی بہترین ایکٹرس کو اس طرح گھورا کرتی۔ جیسے عقاب اپنے شکار کی طرف گھورتا ہے۔ اور جب وہ اپنے کمرے میں تنہا ہوتی۔ تو اس سرگرمی سے اس کی نقلیں اتارا کرتی۔ گویا تھوڑی ہی دیر بعد اسے سٹیج پر آ کر اس کی نقلیں اتارنا ہیں۔ اس کی دلی خواہش تھی۔ کہ وہ فرانس کی بہترین ایکٹرس بن جائے۔ لیکن کامیابی کا زینہ طے کرنے کے لئے تھوڑے سے صبر اور استقلال کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ریچل نے صبر سے بھی اور استقلال سے بھی کام لیا۔ اور پھر اپنے آپ کو فرانس کی ہر دلعزیز ترین ایکٹرس ثابت کر دیا۔

اس زمانہ میں سکالا تھیٹر اپنے ایکٹروں کو بہت تھوڑی تنخواہ دیتا تھا۔ اگرچہ وہ فرانس کا بہترین تھیٹر تھا۔ لیکن اس تنخواہ میں بمشکل ان کا گذارہ ہوتا تھا۔ ریچل کو یہاں ترقی کرنے کا کوئی موقع نہ ملا۔ آخر ۱۹۰۰ء میں اس نے اپنی ایک تصویر بعض اخبارات میں شائع کرائی۔ اس تصویر کی اشاعت سے اسے تھوڑی بہت شہرت حاصل ہو گئی۔ لیکن یہ شہرت ناکافی تھی۔ ریچل چاہتی تھی۔ کہ ملک بھر میں اس کے چرچے ہوں۔ چنانچہ اب اس نے اپنے آپ کو مشہور کرنے کی ایک دوسری ترکیب اختیار کی۔ آخر اس نے ایک مشہور مصور سے اپنی تصویر بنوائی۔ جب وہ پہلے پہل تصویر بنوانے کے لئے مصور کے سامنے بیٹھی تو فرطِ حیا سے اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ مصور کہنے لگا۔

"مس فلوری! آپ گھبراتی کیوں ہیں؟ میں نے بہت سی عورتوں کی تصویریں اتاری

ہیں۔ لیکن جیسا سڈول اور خوبصورت جسم تمہارا ہے۔ ویسا اور کسی عورت کا میں نے نہیں دیکھا۔"

اس تصویر نے ریجن کی شہرت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

اب ریجن کو محسوس ہونے لگا۔ کہ وہ زیادہ مدت تک سکالا میں نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ وہاں اس کی زیادہ قدر نہیں کی جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ اب اس کے مشہور اور ہر دلعزیز ہونے کے دن آ گئے ہیں۔ اور واقعی اس کے قیاسات حقیقت پر مبنی تھے۔ دو سال بعد جب وہ سکالا چھوڑ کر کنسرٹ میل میں آئی۔ تو اس نے ایک شعلۂ جوالہ کی طرح چمکنا شروع کیا۔

ایک شب کنسرٹ میل کی بہترین ایکٹرس تھیٹر کے مالک سے کسی بات پر ناراض ہو کر تھیٹر سے چلی گئی۔ فلوری نے فوراً اس کی جگہ اپنی خدمات پیش کر دیں۔ تھیٹر کا مالک اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ اسے یقین تھا۔ کہ اگر ریجن اس ایکٹرس سے اچھا کام نہیں کر سکتی۔ تو اس سے برا بھی کیا کرے گی۔ چنانچہ اس نے اس کی درخواست منظور کر لی۔

اب ریجن نے اپنے آپ کو مشہور کرنے کے لئے ایک اور سنہری تدبیر سوچی۔ وہ تھیٹر کے مالک سے کہنے لگی۔ "میں اس شرط پر اس ایکٹرس کی جگہ کام کروں گی۔ کہ آپ مجھے اجازت دے دیں۔ کہ میں جیسا لباس چاہوں پہنوں۔" تھیٹر کے مالک نے اس کی یہ درخواست خوشی سے منظور کر لی۔

پندرہ منٹ بعد فلوری جب دوبارہ تھیٹر کے مالک کے کمرے میں داخل ہوئی۔ تو وہ اس کو ایک عجیب حالت میں دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس نے سر سے لے کر ٹخنے تک ایک ایسا چست اور باریک لباس پہنا ہوا تھا۔ جو اس کے خوبصورت اور گدرائے ہوئے جسم کے ساتھ بالکل چمٹا ہوا تھا۔ اور اس لباس سے اس کے جگمگاتے ہوئے جسم کا حسن اس طرح پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ جیسے باریک بادلوں میں سے چاند کی روشنی

چھن چھن کر باہر نکلتی ہے۔ یہ تو تھی اس کی کمر سے لے کر پاؤں تک کی حالت ـــــ اور اس کی کمر سے اوپر کا حصہ بالکل عریاں تھا۔

مالک جھلا کر کہنے لگا: "میں تمہیں اس حالت میں سٹیج پر آنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ اس وقت یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک لڑکی نے عوام کے سامنے نیم برہنہ حالت میں آنے کی جرأت کی ہو۔ لیکن ریجن نے پورا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ کہ وہ تھیٹر کی ایک نئی اور حسین تر دنیا آباد کرے گی۔ اس نے نہایت عاجزی کے ساتھ اپنے مالک سے درخواست کی کہ وہ اسے قسمت آزمائی کی اجازت دے دے۔

ریجن کے بھولے بھالے حسن اور ساحرانہ قوتِ گویائی نے مالک کو اس کی درخواست ماننے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ کہنے لگا: "ریجن آج رات سٹیج پہ آنے کے بعد یا تو پولیس میرا تھیٹر بند کر دے گی۔ یا کل تم فرانس کی مشہور ترین ایکٹرس بن جاؤ گی!"

آخر تھیٹر کے مالک کا دوسرا خیال ہی صحیح نکلا۔ اس رات کنسرٹ میں کے تماشائیوں کو اتنی مسرت حاصل ہوئی۔ جتنی اس سے پہلے کبھی حاصل نہیں ہوتی تھی۔ کھیل کے دوران میں جب ریجن فلوری جو بالکل ایک عریاں پری معلوم ہو رہی تھی سٹیج پر آئی۔ تو تھیٹر کے تمام تماشائی حیرت بھری اور مسرت انگیز چیخوں سے اس کا خیر مقدم کرنے لگے۔ اس کے علاوہ ریجن نے اپنا پارٹ اس خوبی سے ادا کیا۔ کہ اس رات تمام تماشائی اس کے حسن اور اس کے ایکٹ کی تعریفیں کرتے ہوئے واپس ہوئے۔

دوسرے دن پیرس کے نوجوانوں، بوڑھوں، اور عورتوں کی زبان پر ریجن فلوری کا نام تھا۔ جگہ جگہ اس کے حسن کے چرچے ہو رہے تھے۔ اور اخبارات نے تو اس کی تعریفیں کرنے میں حد کر دی۔ اور یہاں تک لکھا "کہ کنسرٹ سیل کو ریجن سے بہتر ایکٹرس ملنی محال ہے"

خوش قسمتی سے پولیس نے بھی اس معاملے میں کوئی مداخلت نہ کی۔ اب دوسرے

تھیٹروں کی ایکٹرسوں نے بھی ریجن کی تقلید کرنی شروع کی۔ لیکن ریجن کی شان ہی جدا تھی۔ جیسا خوبصورت جسم اس کا تھا۔ پیرس کی کسی اور ایکٹرس کا نہ تھا۔ وہ صرف کنسرٹ سیل ہی کی نہیں بلکہ تمام پیرس کی ہردلعزیز اور مقبول ایکٹرس بن گئی۔ ہزاروں لوگ اس کے دیکھنے کے لیے فرانس کے گوشے گوشے سے آنے لگے۔ ریجن اتنی مدت سے جو خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کی تعبیر اب اس کے سامنے تھی۔ ہرشام اس کے کمرے میں خوبصورت پھولوں اور گلدستوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا۔

تھوڑی ہی مدت میں ریجن امیر ہو گئی۔ اور اس کے گلے اور بانہوں میں انمول جواہرات جگمگ جگمگ کرنے لگے۔ اور ا[illegible] لیے دنیا باغ بہشت معلوم ہونے لگی۔ اس وقت اس کی عمر بمشکل اٹھارہ سال کی ہوگی۔ لیکن تمام پیرس اس کا غلام ہو چکا تھا۔ اب اس نے محبت کے سنہرے خواب دیکھنے شروع کئے۔ لیکن ریجن کو اپنے سینے کے قیمتی دل کے لئے کوئی مناسب اور اصلی خریدار فی الحال نہیں ملتا تھا۔

فرانس کے جن ڈرامہ نویسوں نے صرف ریجن کے لئے ڈرامے لکھے۔ ان میں مشہور ڈرامہ نگار پی۔ ایل فلرس کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۱۵ء میں ریجن نے فلرس کے لکھے ہوئے ڈراموں میں اس لاجواب طریقے سے ایکٹ کیا۔ کہ تمام یورپ میں اس کی دھاک بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کی عمر بیس برس کی تھی۔

اس کے بعد اس نے اس ڈرامہ نگار کی ایک اور کامیڈی ہیں "ہنٹر ڈائنا کے سٹیج پر ایکٹ کیا۔ اس وقت ریجن فلورس کا ہر ڈرامے میں اس خوبصورتی سے ایکٹ کرتی تھی۔ کہ تمام پیرس عش عش کر اٹھتا تھا۔

ریجن کے دل میں دنیا کو دیکھنے اور دنیا کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کی بے اندازہ خواہش تھی۔ وہ اپنے بعض دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے کبھی کبھی کبھی چلی جاتی۔ لیکن اسے قدرت نے اس قدر دلچسپی تھی۔ کہ وہ اکثر سیر کا پروگرام

درمیان میں منقطع کرکے واپس آجاتی۔ تاکہ رات کو اسٹیج پر اپنا پارٹ اچھی طرح یاد کرکے ادا کر سکے۔

جب وہ "پیلز تھیٹر" لنڈن کی اسٹیج پر آئی۔ تو پہلے ہی دن اس نے لنڈن کی تمام پبلک کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ لیکن یہ سب کچھ تو تھا۔ اب اسے ایک اور ہی چیز کی تلاش تھی۔

"سیگال تھیٹر" پیرس کی بہترین ایکٹرس نے اپنی سہیلی ریحن کے متعلق اخبارات کے ایک نمائندے سے دوران ملاقات میں کہا۔

"آہ غریب ریحن! اس کی موت میری زندگی کا ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ میں جانتی تھی۔ کہ ریحن کے دل میں رفتہ رفتہ محبت کا زہر سرایت کر رہا ہے۔ میں اسے تباہی کے غار میں گرنے سے بچانے کے لئے مشورے دیتی تھی۔ لیکن وہ میری کسی بات کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ میری تسلیاں اس کے تڑپتے ہوئے دل کو ڈھارس دینے کے لئے ناکافی تھیں۔ جب میں اس کے ساتھ لنڈن گئی۔ تو میں نے اس کی آئندہ زندگی کے متعلق اسے بہترین مشورے دیئے۔ لیکن اس نے میرے مشوروں کا اگر جواب بھی دیا۔ تو ایک تلخ مسکراہٹ سے صرف اتنا کہا۔ کہ کیا میں دن کو بھی خواب دیکھا کرتی ہوں"۔

"پھر اس نے مجھ سے کہا۔ کہ میں لنڈن میں ایک بہترین موقعے کی تلاش میں ہوں" لیکن میں اس موقعے کے راز سے واقف نہ تھی۔ مجھے ہرگز ہرگز اس محبت کا علم نہ تھا۔ جو اس کے دل پر ایک تباہ کن اثر کر رہی تھی۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی تھی۔ کہ ریحن کو کوئی صدمہ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ میں یہ بھی جانتی تھی۔ کہ اس صدمے کا نتیجہ بہت خوفناک نکلنے والا ہے۔ وہ تیس دن بے چین رہتی تھی ——— سیماب کی طرح ...... آخر میرے قیاسات صحیح ہی نکلے"۔

مادام پولیر تو کجا پیرس بھر میں کوئی فرد ریجن کی پرائیویٹ زندگی سے واقف نہ
اور اس کی موت سے قبل کسی کو علم نہ تھا۔ کہ ریجن کو ایک معمولی اور غریب آرٹسٹ
سے محبت ہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں جب اس کی امیدوں کی شمع گل ہو رہی
تھی۔ پیرس میں اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ لیکن ان میں
سے کسی میں بھی صداقت نہ تھی۔

آخر ایک دن تمام یورپ میں یہ سنسنی پیدا کرنے والی خبر مشہور ہو گئی۔ کہ
ریجن فلوری نے دریائے سیلن میں کود کر خودکشی کرنی چاہی۔ لیکن وہ بال بال بچا لی
گئی۔ اس کے بعد فوراً لوگوں نے اس اقدام خودکشی کا راز معلوم کرنے پر اپنی تمام تر
کوششیں مرکوز کر دیں۔ اور آخر معلوم کر لیا۔ کہ ریجن کے غم کا راز اس کی ناکام
محبت ہے۔ بلکہ اس موقعہ پر خود ریجن نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کر لیا۔

اس اقدام خودکشی کے بعد کوئی تین چار ماہ تک ریجن کی شمع زندگی باد مخالف
کے جھونکوں میں نہایت ناتوانی سے جھلملاتی رہی۔ جب اس کی حالت کچھ ٹھیک
ہوئی۔ تو اس کے کمرے میں سینکڑوں خطوط کے بنڈل موجود تھے۔ ہزاروں لوگوں
نے اس سے شادی کرنے کی درخواست کی تھی۔ اور لکھا تھا۔ کہ وہ اسے ایک دیوی
سمجھ کر عمر بھر اس کی پرستش کریں گے ——— سینکڑوں نے اسے لکھا تھا کہ
ہم تمہاری پریشانی، غم اور فکروں کو دور کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ہزاروں نے یہ
لکھا تھا کہ "ریجن! دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔ تمہاری دائمی جدائی سے دنیا بے
رونق ہو جائے گی۔ خودکشی کا خیال اپنے دل سے نکال دو" لیکن ریجن مسکرا مسکرا
کر ان خطوط کو پڑھتی جاتی تھی۔ اور چاک کرتی جاتی تھی۔ جس خط کو اس کی آنکھیں
ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ ان خطوط میں موجود نہ تھا۔

سب خطوط پڑھ کر ریجن نے ایک سرد آہ بھری۔ اور کہنے لگی "یہ آخری بار [illegible]

مجھے ناکامی ہوتی ہے۔ تو دوسری مرتبہ ضرور کامیاب ہو گی۔"

جنگ عظیم کے زمانے میں ریحن پیرس اور لنڈن میں اپنی شہرت کو چار چاند لگاتی رہی۔ اس عرصے میں پیرس کی ایک مشہور ایکٹرس گیبتی کے ساتھ اس کے دوستانہ مراسم ہو گئے۔ ایک شام گیبی کے مراجعتِ سفر کی خوشی میں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ اس پارٹی میں دوسری مشہور ایکٹرسوں کے علاوہ ریحن فلوری بھی مدعو تھی۔ پارٹی کی چہل پہل دیکھ کر اس پر ایک ایسی جنت ارضی کا گمان ہوتا تھا۔ جس میں حسین ترین حوریں اپنے حسن سے جہان بھر کو منور کر رہی ہوں۔ تمام مہمانوں کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن ریحن خاموش تھی۔ وہ نہایت بے دلی سے وہاں بیٹھی تھی۔

اس تقریب میں ایک شاندار رقص کا بھی انتظام کیا گیا تھا۔ اور اس مقصد کے لئے ہال کے ایک طرف ایک نہایت نفیس سٹیج بنایا گیا تھا۔ گیبی اور فلوری نے اس سٹیج پر آ کر اپنے سحر انگیز رقص سے حاضرین کو مسحور کیا۔ اور رقص ہونے کے بعد فلوری تھک کر اس چبوترے پر ایک تختے کی آڑ لے کر لیٹ گئی۔ چبوترے کے عین سامنے ایک اور تختے کی آڑ میں ہواتی سے بلائے ہوئے بینڈ بجانے والے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کو ریحن نے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور کہا "میں نے سنا ہے کہ تمہاری سرزمین ہواتی" بہت خوبصورت ہے "

بینڈ بجانے والے نے جواب دیا۔ "اس میں کیا شک ہے "

ریحن نے کہا۔ " اور اس سرزمین میں ایک آتش فشاں پہاڑ بھی ہے "

بینڈ بجانے والے نے جواب دیا۔ " ہاں ہمارے ملک کا آتش فشاں پہاڑ دنیا کے تمام آتش فشاں پہاڑوں سے زیادہ خوبصورت اور تیز و تند ہے "

ریحن نے پوچھا۔ " کیا وہ ہمیشہ آبدار رہتا ہے؟"

اس کے جواب میں اس آدمی نے اس پہاڑ کے مختصر حالات بیان کئے۔ اور ریحن

انہیں نہایت دلچسپی سے سنتی رہی۔

پھر اس نے پوچھا "اگر کوئی شخص اس پہاڑ پر چڑھ کر اس کے دہکتے ہوئے دہانے میں کود پڑے۔ تو کیا وہ فوراً مر جاتے ہے؟"

آدمی نے حیرت سے اس کے منہ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اس میں کیا شک ہے؟"

ریحن مسکرا کر کہنے لگی۔ "تو پھر میں تمہارے ساتھ یہاں ضرور آؤں گی۔" اس کے بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اس گفتگو سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ ریحن نے خودکشی کا کس قدر مصمم ارادہ کر رکھا تھا۔

ہو اتفاق کے کوہ آتش فشاں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے کا موقع تو اسے نہ مل سکا۔ لیکن چند ہی دن بعد لنڈن میں اس نے خودکشی کر لی۔

وہ اپنے اجلے بستر پر ایک نازک کلی کی طرح بے جان پڑی تھی۔ اور اس کی خوبصورت سہیلی گیبی کے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مس کر رہے تھے۔

میریا آف لیمبارڈ سٹریٹ

انگلستان کے زندہ جاوید ادیب کی محبوبہ میریا بیڈنل کے افسانہ محبت سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ حال ہی میں اس حسینہ کے چند خطوط جو اس نے چارلس ڈکنس کو لکھے شائع ہوئے ہیں۔ جن سے میریا اور چارلس کے افسانہ محبت کا پتہ چلتا ہے۔

لیمبارڈ سٹریٹ لنڈن میں جارج بیڈنل نامی ایک شخص رہتا تھا۔ وہ ایک بنک کا مینیجر تھا۔ اور نہایت دانشمند۔ خوش ذوق اور اچھا خاصہ سیاستدان ہونے کے علاوہ بڑا مہمان نواز۔ مخلص اور بامروت شخص تھا۔ اس کی بیوی کسی طائر بہار سے بھی زیادہ حسین اور باغ رضواں کی سنہری تتلی سے بھی زیادہ کشش انگیز اور چنچل تھی۔ ادھیڑ عمر میں بھی وہ بیست سالہ دوشیزہ معلوم ہوتی تھی۔

اس کی تین لڑکیاں تھیں۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب ۔۔۔ ایک کا نام مارگریٹ دوسری کا اینے اور تیسری کا میریا تھا۔ تینوں بلا کی حسین تھیں۔ اور حسین ماں باپ کی اولاد کیوں نہ حسین ہوتی۔

مارگریٹ سب سے بڑی تھی۔ اس کی شادی ڈیوڈ لائیبڈ نامی چائے کے ایک تاجر سے ہوئی تھی۔ دوسری لڑکی اینے بھی ہنری کول نامی ایک تاجر سے بیاہی گئی۔ سب سے چھوٹی میریا تھی۔ جس کا حسن ستارہ سحری تھا۔

اس کی آنکھیں سمندر کی طرح نیلگوں۔ اس کی پیشانی برف سی سفید۔ اس کے ہونٹ گل کی پنکھڑی کی طرح نازک اور اس کے رخسار گلاب کے پھول کی طرح سرخ تھے۔ اس کا

مخملیں سینہ نور کے سانچے میں ڈھلا تھا۔ جب وہ مستانہ وار چلتی تو یوں معلوم ہوتا۔
جیسے اُجڑے ہوئے چمن میں بہار آگئی ہے۔ اس کی اداؤں سے پھول برستے تھے۔
اور اس کی نگاہوں کی چمک سے ستاروں کی بارش ہوتی تھی۔ جب وہ اپنی نازک کمر
بید کی شاخ کی طرح لچکاتی ہوتی چلتی۔ تو دیکھنے والے دِل تھام کر رہ جاتے لیمبارڈ
سٹریٹ کا کون سا نوجوان تھا۔ جس کی نگاہِ عشق نے اس کے احمریں ہونٹوں اور پھول
سے رخساروں کی بلائیں نہ لی ہوں۔ کون سا نوجوان تھا۔ جسے وہ مقناطیس کی طرح
اپنی طرف نہ کھینچتی تھی۔ اس کی مسموم نگاہی سے کون بچ سکتا تھا۔ وہ ایک تلوار
تھی۔ جو قتل عام برپا کرتی ہوتی باہر نکلتی۔ اس کے رعبِ حسن کی وجہ سے کسی کو اس
سے آنکھیں تک ملانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

موسم بہار کے اس پھول نے آخر انگلستان کے ایک مایۂ ناز ادیب کو اپنی طرف
متوجہ کیا۔ نوجوان ادیب دِل تھام کر رہ گیا۔ راتوں کو اس کے خوابوں میں اس حورِ فردوس
کے قدموں کی دلکش چاپ سنائی دینے لگی۔ رفتہ رفتہ محبت نے عشق کی صورت اختیار
کی، اور عشق نے دیوانگی کی ——

چارلس ڈکنس نے اب سوچا کہ باغِ حسن کی اس حسین ترین بلبل کی نگاہ مجھ پر پڑ
تو گئی ہے۔ اب اسے محبت کے پنجرے میں بند کرنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیئے۔
چنانچہ اس کی راتیں نہایت بے تابی سے بسر ہونے لگیں۔ بلکہ اس کی دیوانگی اس حد تک
پہنچی۔ کہ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا۔ اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا۔
چند ماہ انتہائی پریشانی میں گزرے۔ نہ تو اس کی محبوبہ کو نہ اُسے باہمی ملاقات کی کوئی
تدبیر نظر آتی تھی۔ وہ اکثر لیمبارڈ سٹریٹ میں آوارہ گردوں کی طرح پھرتا رہتا ——
اس بات کے انتظار میں کہ شاید وہ "بلبلِ خوشنوا" نظر آجائے۔ جس کی آواز اسے چاندی
کی گھنٹیوں کی آواز کی طرح تیز طرار شوخ اور دلکش معلوم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی لیمبارڈ سٹریٹ

میں آوارہ گردی کرنے کا خوشگوار نتیجہ بھی برآمد ہو جاتا۔ یعنی حسن کی ملکہ میریا اسے گھر سے نکل کر بازار کی طرف جاتی ہوتی اور اس پر نگاہوں کے پھول برساتی ہوتی گزر جاتی۔ وہ پھر مڑ آتا۔ تاکہ اس کے پھول سے چہرے، ستاروں کی سی آنکھیں اور مخملیں سینے پر اس کی نگاہ بیتاب پڑ جاتے۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے۔ کہ انگلستان کا مایۂ ناز اور زندۂ جاوید ادیب اس شمع حسن کے گرد اس طرح دیوانہ وار طواف کرتا۔ جس طرح کبھی کسی پروانے نے بھی شمع کے گرد نہیں کیا۔

چارلس ڈکنس پر عالم شباب تھا۔ اور اس کی رگ رگ میں جوش جوانی انگڑائیاں لے رہا تھا۔ جب اس پروانے کو حسین شمع نظر آ گئی۔ تو اس کا بند بند محبت کے میٹھے میٹھے درد سے ٹوٹنے لگا۔ اس کے دل میں بے تاب آرزوئیں۔ اور خواہشیں جنم لینے لگیں۔ وہ راتوں کو اس نرم و نازک مخملیں مجسمے سے ہم آغوش ہونے کے رومانی خواب دیکھنے لگا۔ دوسری طرف جوشِ جوانی تھا۔ کہ اس کی امنگوں، حسرتوں اور محبت کرنے کی تمناؤں کو بیتاب کر رہا تھا۔ میریا بھی جلد ہی اس کی محبت کے خواب دیکھنے لگی۔

آخر تقدیر کی ہیبتناک دیوی نے تدبیر کی حسین دیوی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور عاشق کے لئے محبوبہ سے جو خود بھی اس سے ملنا چاہتی تھی۔ ملاقات کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔

اپنے کے شوہر کوٹنے سے چارلس ڈکنس نے دوستی پیدا کر لی۔ اور یہ دوستانہ تعلقات اس قدر خوشگوار ہوئے۔ کہ ڈکنس وقتاً فوقتاً میریا کی بہن اپنے کے گھر آنے جانے لگا۔ اس وقت ڈکنس نے سکول کا آخری امتحان پاس کر کے "کورٹس آف ڈائرکٹرز کامنز" میں رپورٹر کی ملازمت حاصل کر لی۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ ایک دن اپنے اسے اپنی بہن میریا کے گھر لے گئی۔ اور وہاں اس بے تاب عاشق کا اس کی محبوبہ سے رسمی تعارف کرایا گیا۔ حالانکہ دونوں پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔

چندہی دنوں بعد میریا کے گھروالوں سے ڈکنس کے اتنے تعلقات پیدا ہو گئے، کہ وہ وقتاً فوقتاً اسے اپنے گھر بلانے لگے۔ میریا خود کسی نہ کسی بہانے سے اُسے اپنے گھر بلا لیتی۔ آخر میریا کی بیتاب نگاہیں ڈکنس کے دل میں میٹھا میٹھا درد پیدا کرنے لگی۔ ڈکنس صحیح معنوں میں ایک نوجوان تھا۔ اور پھر خوبصورت نوجوان ایک حسین دوشیزہ کے دل کا صبر وقرار لوٹنے میں اسے دشواری پیش نہ آئی۔ اب اشاروں ہی اشاروں میں اور نگاہوں ہی نگاہوں میں اظہار محبت کی باتیں ہونے لگیں۔ میریا نے خود نمائی کے لئے اپنی شرمیلی اداؤں اور شوخ باتوں میں اور بھی زیادہ کشش پیدا کر دی۔ اور اپنے نوجوان عاشق کے جذبات کو بیدار کرنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔

اس وقت ڈکنس کی عمر اٹھارہ سال کی تھی۔ اور اس کی محبوبہ اپنی زندگی کی انیس بہاریں دیکھ چکی تھی۔ یہ واقعہ ۱۸۳۰ء کا ہے۔ ڈکنس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اس کے مقابلہ میں میریا کے والدین بہت امیر کبیر تھے۔ اپنی محبوبہ سے کورٹ شپ کرنے کی خاطر اسے اپنے لباس کا بھی خاص خیال رکھنا پڑتا تھا۔ اور میریا کے لئے تحفے مہیا کرنے میں تو اسے بہت زیادہ دشواری پیش آتی تھی۔ لیکن ان تحائف کا خرچ وہ ٹیوشنوں سے نکال لیتا تھا۔

محبت کی راہ میں افلاس اور تمول کا امتیاز ایک بے معنی شے ہے۔ یہاں بھی یہی حقیقت کار فرما ہوئی۔ میریا نے مطلق اس بات کی پرواہ نہ کی کہ اس کا عاشق غریب ہے۔ اور اس لئے وہ اس سے شادی نہیں کر سکتی۔ بلکہ دونوں نے اپنے جذبات کی زرنار کشتی کو محبت کے سمندر میں دھکیل دیا۔

اب پوشیدہ ملاقاتوں کا دور شروع ہوا۔ دن ہوٹلوں میں اور راتیں باغوں میں بسر ہونے لگیں۔ ان ملاقاتوں کا پتہ ذیل کے ایک خط سے بھی ملتا ہے۔ جو

مارچ ۱۸۳۱ء میں ڈکنس نے اپنی محبوبہ کو روانہ کیا۔

جان و دل سے پیاری میریا

میں اکثر سوچتا ہوں کہ میں دنیا میں ہوں۔ یا جنت کے کسی گوشے میں۔ یقیناً میں دنیا میں نہیں ہوں۔ تم میری جنت ہو۔ اور جب تک تمہاری نگاہِ محبت میری طرف مبذول رہے گی۔ میں اپنے آپ کو جنت ہی میں محسوس کروں گا۔ پیاری میریا! مجھے تمہاری محبت نے دیوانہ کر دیا ہے۔ مجھے ہر جنبشِ ہوا عطر کا ایک جھونکا معلوم ہوتی ہے۔ مجھے ہر پھول پیغام مسرت دیتا ہے۔ باغوں کا ہر پودا خوشی سے جھومتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور ہر پرندہ مسرت کے گیت گاتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کس لئے ہے؟ اس لئے کہ تم مجھ پر مہربان ہو۔ میرے مرتعش ہونٹوں کو تمہارے احمریں ہونٹوں کے بوسے میسر ہیں۔ تمہاری مرمریں گردن پر میں محبت کی مہریں ثبت کر سکتا ہوں۔ تمہاری نازک کمر میں اپنے ہاتھ ڈال سکتا ہوں تمہارے سینے پر اپنا سر رکھ سکتا ہوں۔ اور تم سے ہم آغوش ہو سکتا ہوں۔ تمہارے سمگوں جسم کی بہاریں لوٹ سکتا ہوں۔ پیاری میریا! تمہاری شراب وصل کا خمار میری رگ رگ میں رچا ہوا ہے۔ اور ہم آغوشی کے وقت تمہارے جسم کے لمس نے میرے جسم میں سرور و انبساط کی جو سنسنی دوڑائی تھی۔ اس کا لطف میں اب تک تصور میں اٹھا رہا ہوں۔ اب میں نے محسوس کیا ہے۔ کہ تمہاری جدائی میرے لئے کس قدر دشوار ہے۔ میری روح اور میرا جسم، تمہاری روح اور تمہارے جسم میں جذب ہونے کے لئے تیار ہے۔ آہ تم مجھ سے کیوں جدا ہو؟

کیا کل رات تم میری شمع شبستان ہو گی؟

ہمیشہ کے لئے تمہارا ...... ڈکنس

عاشق اور محبوبہ محبت کے سمندر میں بہ رہے تھے۔ دنیا کی طرف سے وہ بالکل غافل تھے۔ ایک حسین نوجوان اور ایک حسین دوشیزہ اس حالت میں، جو کچھ کر سکتے ہیں۔ انہوں نے

کیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو محبت کی شراب پلائی۔ اور اس طرح دونوں اس کے نشے سے چُور چُور ہو کر دنیا کی طرف سے بالکل غافل ہو گئے۔

ذیل کے ایک خط سے جو پیارلس ڈکنس کی محبوبہ نے اسے بھیجا تھا۔ معلوم ہوگا۔ کہ جوشِ جوانی کے نشے نے انہیں دنیا سے کس قدر غافل کر رکھا تھا۔ اور وہ محبت کے سمندر میں دو تنکوں کی طرح بہے جا رہے تھے۔

پیارے!

تم میری زندگی کی کشتی کو کہاں لئے جا رہے ہو۔ جس طرح ایک تنکے کو سمندر کی ایک زبردست لہر اپنے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق بہا لے جاتی ہے۔ اور تنکے کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اسی طرح تم میری کشتی کو اپنی مرضی کے مطابق نجانے کہاں بہائے لئے جا رہے ہو۔ میں عورت ہوں انجان اور بے خبر کہیں میری کشتی کو منجدھار میں نہ چھوڑ دینا۔ اُف! میری روح کانپتی ہے۔ تم جو کچھ چاہتے ہو مجھ سے کرا لیتے ہو۔ ایک ساحر کی طرح میں حیران ہوں۔ کہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے کیوں سائے کی طرح لگی رہتی ہوں۔ اپنی جوانی اس والہانہ انداز میں کیوں تم پر نچھاور کر رہی ہوں۔ ساحر مجھے اپنے سحر سے نجات دے۔ نجانے میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔ میری روح کانپ رہی ہے۔

میرے پیارے آؤ۔ اب جلد اس مقدس رشتے میں منسلک ہو جائیں اور جو ہمیں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ کر سکے۔

تمہاری ——— میریا

لیکن تقدیر کی ہیبت ناک دیوی ایک طرف کھڑی تقدیر کی دیوی کی عارضی کامیابی پر مسکرا رہی تھی۔ یکایک عاشق اور معشوقہ کا ستارہ نحوست کے چکر میں آگیا۔ اور انہیں ایک دوسرے سے جُدا ہونا پڑا۔

ایک دن جب کہ خوشگوار دھوپ کھلی ہوئی تھی۔ ہوائیں درختوں کی شاخوں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ اور تتلیاں پھولوں کا منہ چوم رہی تھیں۔ میریا ایک باغ میں اپنے محبوب سے چوری چھپے ملنے آئی۔ اب وہ کھلم کھلا ڈکنس سے ملاقات نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ ان دنوں لڑکیاں شادی سے پہلے بالکل تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتی تھیں۔ دوسرے والدین کی مشکوک نگاہوں نے بھی دونوں کے دل کے راز کو پالیا تھا۔

ہاں تو جس طرح کسی خزاں رسیدہ چمن میں بہار آتی ہے۔ اسی طرح ایک ادائے دلنشیں کے ساتھ اپنی بید کی سی نازک اور پتلی کمر لچکاتی ہوئی قدم قدم پر ناز و ادا کے پھول بکھیرتی میریا باغ میں داخل ہوئی۔ عاشق اس کا خیر مقدم کرنے کے لئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد " پروانہ " اپنی متحرک شمع کے ساتھ باغ کے ایک گھنے کنج کی طرف روانہ ہوگیا۔

دونوں درخت کی ایک شاخ کے نیچے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ نہ جانے میریا کو کیا خیال آیا۔ کہ اس نے یکایک اپنے عاشق کی باہوں میں اپنے مرمریں بازو ڈال دیئے اور اپنے مخملیں ہاتھوں سے خفیف سا جھٹکا دے کر اپنے محبوب کا سر اپنے قریب کر کے اس کے ہونٹوں پر اپنے مرتعش ہونٹ رکھ دیئے۔ نہ جانے وہ کتنا عرصہ لطف و سرور کے اس نشے میں غرق رہے۔ بہر حال ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب انہیں چونک کر ایک دوسرے سے ہونٹ جدا کرنے پڑے ــــــ اس وقت انہیں یوں محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے ان کے سینے میں دو دھارا خنجر بھونپ دیا ہو ــــــ خشک پتوں کے قدموں سے مسلے جانے کی آواز آئی۔ اور ساتھ ہی .... درختوں کے جھنڈ میں میریا کی ایک بد باطن سہیلی جو خود چارلس ڈکنس پر عاشق تھی۔ بلائے ناگہانی کی طرح نمودار ہوئی۔ اس نے یہ حسین اور رومانی لیکن " دردناک " منظر دیکھ لیا تھا۔ اور وہ دیوانی ہو کر انہیں کے تعاقب میں آئی تھی۔

اس کمینہ خصلت عورت نے آتشِ رقابت سے جل کر ڈکنس اور میریا کی محبت کا راز بہت بُری طرح سے افشا کردیا۔ اور غالباً اس واقعہ کی اس کے والدین کو بھی خبر کردی۔ جنہوں نے میریا کو متنبہ کردیا۔ کہ آئندہ وہ چارلس سے ہرگز ہرگز نہ ملے۔

لیکن میریا کو ڈکنس کے بغیر اور ڈکنس کو میریا کے بغیر کس طرح قرار آسکتا تھا۔ اب پھر اپنے کا شوہر ہنری کولے ڈکنس اور میریا کی خط و کتابت میں قاصد کے فرائض انجام دینے لگا۔

اب ڈکنس کے پیشِ نظر سب سے اہم مسئلہ اس سے شادی کرنے کا تھا۔ میریا کے والدین اسلئے اپنی لڑکی کی شادی ڈکنس سے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ کہ ڈکنس کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ اس کے برعکس وہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ڈکنس اپنی محبوبہ سے جُدا ہو چکا تھا۔ جدائی اس کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اب اس نے قطعی فیصلہ کرلیا۔ کہ وہ اپنا معیار زندگی بلند کرکے اپنے آپ کو میریا سے شادی کرنے کے قابل بنائے گا۔ چنانچہ انتہائی جوش اور جذبے کے ساتھ اس نے مرتوڑ محنت کرنی شروع کی۔ اور لنڈن کے ایک مقتدر اخبار کا پارلیمنٹری رپورٹر مقرر ہونے کے لئے انتہائی کوششیں صرف کردیں۔ لیکن اسے اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب اس نے اپنی توجہ تھیٹر کی طرف مبذول کردی۔ اسے اداکاری کا اس قدر جنون ہوا۔ کہ وہ دن رات اپنے گھر میں اس کی مشق کرتا رہتا۔ کبھی اس کمرے میں جاتا۔ کبھی اس کمرے میں۔ کبھی کسی طرح کی شکل بناتا۔ کبھی کسی طرح کی۔ اور اپنی حرکات و سکنات درست کرتا رہتا۔

۱۸۳۲ء میں اُسے کوونٹ گارڈن تھیٹر میں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد اُس نے اخباری دنیا میں قدم رکھا۔ اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔ اس سے یہ سب کچھ میریا کی محبت کرا رہی تھی۔ اور اس نے اپنی زندگی میں کئی مرتبہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا۔

۱۸۳۲ء میں ڈکنس کی زندگی میں ایک ایسا حادثہ پیش آگیا۔ جس کی اُسے قطعی امید نہ

تھی۔ یعنی میریا ڈکنس کی محبت، سے دست بردار ہوگئی۔ اس نے اس کے تمام خطوط اور تحائف واپس کردیئے۔ یہ حادثہ ڈکنس کے لئے موت سے کم نہ تھا۔ اس موقعہ پہ اس نے اپنے دوست ہنری کولے کی معرفت میریا کو یکے بعد دیگرے پانچ درد انگیز رومانی خط لکھے۔ جن میں اس نے اپنی محبوبہ سے نہایت درد انگیز لہجے میں درخواست کی کہ وہ اس کی زندگی تباہ نہ کرے۔

اس موقعہ پر ایک خط میں ڈکنس نے اپنی محبوبہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا کہ :۔

"تم نے اگر پیمان وفا توڑ لیا ہے۔ تو میں نے نہیں توڑا۔ گزرے ہوئے دنوں کی خوشگوار یاد ہمیشہ میرے دل کو مغموم رکھیگی۔ آہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ یکایک مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑنے والی ہے۔ میں تباہ ہونے والا ہوں۔ میرے دل کا صبر و سکون لٹ جانیوالا ہے۔ آہ میریا! تم نے میرے دل سے خوشی کی ایک ایک رمق لوٹ لی۔ میریا! میں تمہیں کس طرح بھولوں۔ آہ! میں ایک حسین خواب دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس سے نہایت بیرحمی کے ساتھ چونکا دیا گیا ہے۔ آخر میریا تمہیں ہوا کیا ہے؟ تم یکایک کیوں مجھ سے اس طرح دور ہو گئی ہو۔ جیسے مشرق سے مغرب، جیسے شمال سے جنوب، معلوم نہیں میری خطا کیا ہے۔ تم نے ایک مرتبہ ایک خط میں مجھے لکھا تھا۔ کہ" ڈکنس تم میری محبت کی کشتی کو نہ جانے کدھر لئے جارہے ہو۔ اور نہ معلوم کیا حادثہ پیش آنے والا ہے۔ کہیں میری کشتی کو عین منجدھار میں نہ ڈبو دینا۔" اب یہی الفاظ میں تمہیں لکھتا ہوں۔ میری کشتی حیات ڈوب رہی ہے۔ میریا! اچھی میریا!! اسے بچالو۔ بچالو! بچالو!

تمہارا ———— ڈکنس

یہ خط مارچ ۱۸۳۲ء میں لکھا گیا تھا۔ ڈکنس کو مطلق خبر نہ تھی۔ کہ اس کے گلشن محبت سے اس کی حسین تیتری کیوں اڑ گئی ہے۔

بعد میں ڈکنس کو معلوم ہوا۔ کہ یہ سب میریا کی سہیلی میرین لے کی کارستانی ہے۔

—— میری لے نے جو خود ڈکنس پر عاشق تھی۔ جاکر میریا سے کہا کہ "ڈکنس مجھ پر عاشق ہے اور ہم ایک شبِ وصل بھی بسر کر چکے ہیں۔"

میریا کو اپنے محبوب کی "غداری" کا بے حد رنج ہوا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ آئندہ وہ ڈکنس سے کوئی تعلق نہ رکھے گی۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میری لے کی محبت سے ڈکنس ضرور متاثر ہوا تھا۔ اور ان کے کچھ رومانی تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے۔ لیکن بہر حال اس کا بیان مبالغہ آمیز ضرور تھا۔ اور اس نے یہ چال محض اس لئے کھیلی تھی کہ "میدان" اس کے لئے صاف ہو جائے۔

۱۲ مارچ ۱۸۳۳ء کو چارلس ڈکنس اور میریا ایک مرتبہ پھر ایک دوسرے سے ملے چارلس ڈکنس نے میریا کے عائد کردہ الزامات کی تردید کی اور کہا۔ کہ اگر تم اجازت دو تو میں میری لے کو خط لکھ کر پوچھوں۔ کہ اس نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ اور یہ شرمناک الزام مجھ پر کیوں لگایا ہے؟ گلوں شکوؤں کے بعد بالآخر فیصلہ ہوا کہ میری لے کو خط بھیج دیا جائے۔

اس ملاقات سے پہلے چارلس ڈکنس نے میریا کو ایک خط میں لکھا کہ:۔

"خدا جانتا ہے۔ کہ میں نے آج تک تمہارے سوا کسی لڑکی پر نگاہِ محبت ڈالی ہے نہ کسی سے محبت کی باتیں کی ہیں نہ کروں گا۔ میری مرکزِ محبت تو صرف تم ہی ہو۔ تمہارے التفات نے میری روح کو جتنا سکون بخشا تھا۔ اس سے ہزار گنا زیادہ اضطراب میں مجھے تمہاری بے التفاتی نے مبتلا کر رکھا ہے۔ میری ذات کو تمہاری ذات سے جتنا فائدہ پہنچا ہے۔ اتنا شاید ہی کسی عورت کے وجود سے کسی مرد کو پہنچا ہو۔ تم نے جس انداز میں میری قدردانی کی۔ اس کا میں تمام عمر ممنون رہوں گا۔ تمہارے احسانات کے بار سے میری گردن خم ہو رہی ہے۔ مجھے جرأت نہیں پڑتی۔ کہ تم سے مزید احسانات کا مطالبہ کروں۔ لیکن آہ! اس بات کا کیا علاج ہے۔ کہ تمہاری خفگی نے میری جان عذاب میں ڈال دی ہے ......"

" چارلس ڈکنس نے میری لے کو جو خط لکھا۔ وہ کہ لے کی وساطت سے میریا کو بھیجا

گیا۔ تاکہ وہ دیکھ لے کہ خط کی عبارت مناسب ہے یا نہیں۔ لیکن میریا نے یہ خط پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اپنے عاشق کی درد بھری منتوں اور التجاؤں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اور انتہائی سرد مہری سے اس نے کہہ دیا۔ کہ "میں اب ڈکنس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی"۔

معلوم نہیں میریا کو ڈکنس سے کیوں نفرت ہو گئی تھی۔ کہ وہ اس کے انتہائی پرخلوص خطوط کو بھی رد کر رہی تھی۔ اور اس کی التجاؤں کا کسی طرح اس کے سرد مہر دل پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ آخر ڈکنس نے تھک کر صلح کی کوششیں ترک کر دیں۔

ڈکنس کے دل سے کسی طرح میریا کی یاد محو نہیں ہوتی تھی۔ وہ اس کی یاد کو بھلانے کی خاطر پھر اخباری دنیا میں آگیا اور اس نے سرتوڑ محنت شروع کی۔ تاکہ مشغولیت کی وجہ سے اسے میریا بھولی رہے۔

۱۸۳۶ء میں چارلس ڈکنس نے اپنے ایک شریک کار مسٹر ہاگارتھ کی خوبصورت بہن سے شادی کر لی۔ اس عرصے میں میریا نے بھی لوئیس ونٹر نامی ایک نوجوان سے شادی کر لی تھی۔ چارلس کے دل سے ابھی میریا کی یاد محو نہیں ہوتی تھی۔ اس نے اس کے باپ سے اب بھی مخلصانہ خط و کتابت جاری رکھی۔ تاکہ اسے معلوم ہو کہ ڈکنس جیسے آدمی سے اپنی بیٹی کی شادی نہ کرنے میں اس نے کس قدر غلطی کی ہے۔

ڈکنس کے ناولوں میں بھی جا بجا میریا کی محبت کارفرما نظر آتی ہے۔ "ڈیوڈ کاپرفیلڈ" میں ڈورا کے پردے میں میریا ہی چھپی ہوتی ہے۔

اس کے بعد ڈکنس اور میریا بیس سال تک ایک دوسرے سے نہ ملے۔ میریا اب ایک خواب کی طرح ڈکنس کی رومانی دنیا سے غائب ہو چکی تھی۔ لیکن بیس سال کے بعد یکایک۔ وہ پھر غیر متوقع طور پر ڈکنس کے گلشن زندگی میں نمودار ہوئی۔ یعنی اس نے ایک نہایت ہی پرخلوص خط اپنے عاشق کو بھیجا۔ جسے پڑھ کر عاشق کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ڈکنس نے اس خط کے جواب میں لکھا۔

میری پیاری مسنر ونٹر!

تمہارا خط پڑھ کر میرا غنچۂ دل مسرت سے کھل گیا۔ آہ معلوم نہیں۔ اس دنیا میں بہترین اور مخلص دوست بھی کیوں ناگہاں ایک دوسرے سے جُدا ہو جاتے ہیں۔ آہ اس دنیا میں کیسے کیسے عجیب واقعات پیش آتے ہیں۔ اس وقت میں اپنے قلبی احساسات تم سے بیان نہیں کر سکتا۔ دل ایک دردناک مسرت محسوس کر رہا ہے۔ اور گزرا ہوا زمانہ میری آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ وہ باغوں کی سیریں ——— وہ ملاقاتیں ——— وہ باتیں ——— مجھے اب تک یاد ہیں۔ تمہاری جدائی کا صدمہ جس قدر مجھے ہوا۔ اس کا اندازہ صرف مجھ ہی کو ہو سکتا ہے۔ میری تمام زندگی ہی تم نے تباہ کر دی ہے۔ میریا! ایک مرتبہ پھر تم میری زندگی کے اجڑے گلشن میں بہار بن کر آجاؤ۔۔۔۔۔۔"

ایک دن یکایک غیر متوقع طور پر میریا ڈکنس کے گھر آگئی۔ وہ ڈکنس کے حال پر مہربان نظر آتی تھی۔ وہ اپنے عاشق سے انتہائی ملاطفت کے ساتھ پیش آئی۔ لیکن آہ ڈکنس بیس سال سے جو رومانی خواب دیکھ رہا تھا۔ اس سے وہ یکایک چونک گیا۔ جس دیوی کی وہ بیس سال سے پرستش کر رہا تھا۔ اب وہ گوشت پوست کا ایک [illegible] بھونڈا مجسمہ بن چکی تھی۔ میریا وہ پہلی سی میریا نہیں رہی تھی۔ ڈکنس اس کی طرف دیکھ کر چونک اٹھا۔ اور چلا کر کہنے لگا "نہیں نہیں تم میریا نہیں ہو۔ تم کوئی اور عورت ہو۔ میری میریا جس سے میں ملنے کا بیس سال سے انتظار کر رہا ہوں۔ موسم بہار کے سب سے زیادہ خوشنما پھول سے بھی زیادہ حسین ہے۔ میں اب بھی اس کی پرستش کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا۔ نہ جانے تم کون ہو" یہ کہہ کر ڈکنس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

میریا کی آنکھیں جھک گئیں۔ اور اس کی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ آہ! اس کا حسن ماند پڑ چکا تھا۔ چاند گہن میں آگیا تھا۔ پھول مرجھا گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔

میریا پر فرطِ غم سے دیوانگی کی حالت طاری ہوگئی۔ اور وہ گھبرا کر وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور کہنے لگی " میں جاتی ہوں"

لیکن ڈکنس نے دوڑ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اور کہنے لگا " نہیں نہیں! میں تمہیں نہیں جانے دوں گا"

میریا کبھی کبھی ڈکنس کے گھر اس سے ملنے کو آجاتی۔ لیکن اپنے رومانی خواب سے وہ چونک چکا تھا۔ وہ ہمیشہ اس سے کتراتا اور مشغولیت کا بہانہ کر کے اس کی طرف بہت کم توجہ کرتا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ کہ اسے جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے بہت زیادہ کام کرنا پڑتا تھا۔

میریا نے محسوس کیا۔ کہ اب اس کی ذات ڈکنس کے لئے کسی دلچسپی کا باعث نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ وہ ڈکنس کے وطن سے چلی گئی۔ اور تین سال تک انہوں نے ایک دوسرے کو کوئی خط نہ لکھا۔

اس واقعہ سے تین سال بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں ڈکنس نے کسی باہمی رنجش کی بنا پر اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ سب سے پہلے اس واقعہ کی خبر میریا ہی کو ملی۔ اگرچہ ڈکنس نے اسے خود نہیں لکھا۔ کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے۔ بلکہ میریا نے اپنی کوشش سے یہ راز معلوم کر لیا۔ کیونکہ اب وہ ڈکنس کی ہر بات سے دلچسپی لیتی تھی۔

میریا نے لمبی عمر پائی۔ کہا جاتا ہے۔ کہ وہ ہمیشہ ڈکنس کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کیا کرتی تھی۔ اور بڑے فخر کے ساتھ اپنی سہیلیوں سے اپنا اور ڈکنس کا افسانہ محبت بیان کیا کرتی۔